Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed
Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda,
Hyderabad, Deccan

ISSN:-2454-4035

انوار تحقیق

Volume sixth

January-june 2019

شمارہ ۱۔۶

قیمت ۵۰روپے

Editor

سید الیاس احمد مدنی

Address
9-10-380,-Neem Bowli Masjid, Machora House, Golconda Fort, Hyderabad, Telangana 500008

Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magzine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan

ISSN:-2454-4035

ANWAR-E-TAHQEEQ

Volume: Sixth

January - June 2019

Issue:1-6

Price: Rs. 50/-

Editor

Syed Iliyas Ahmed Madni

Address
9-10-380,-Neem Bowli Masjid, Machora House, Golconda Fort, Hyderabad, Telangana 500008

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ...................

انوار تحقیق

جلد۔۶ شمارہ۔۱ تا ۶ جنوری تا جون ۲۰۱۹ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۵۰ روپئے سالانہ:۔۵۰۰ روپئے

نگراں:۔**پروفیسر عزیز بانو**، صدر شعبہ فارسی، مانو، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر:۔**سید الیاس احمد مدنی**

زرتعاون کا ذریعہ:

Mr. Mubarak Hussain

Accnt no.: 50045054076

IFSC CODE: ALLA-0210134

Allahabad Bank, AMU, Aligarh

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔ 008 500

موبائل نمبر:۔ 09966647580 ای میل:۔ anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر صولت علی خان۔ڈائرکٹر اے پی آر آئی ٹونک

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

محمد توصیف خان کاکر۔شعبۂ فارسی، اے ایم یو۔ علی گڑھ

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''دبیر''۔کاکوری لکھنؤ

ارمان احمد

مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ''عرفان''۔چھپرا، بہار

عاطفہ جمال

مدیر سالنامہ ''کوکب ناہید'' سندیلہ، ہردوئی

ڈاکٹر ای اے حیدری۔صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ لوہیا کالج چورو

متھی علی خان۔نامہ نگار روزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن

عباس حیدر نقوی، رسرچ اسکالر، اے ایم یو علی گڑھ

مجلس مشاورت

پروفیسر مسعود انور علوی۔شعبہ عربی اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

پروفیسر سید حسن عباس۔شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید۔صدر شعبہ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

احمد علی، کیپر مینسکر پٹ۔سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں۔شعبۂ فارسی، مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	زبان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	ضیاءِ تصوف			۳
۲۔	مسدس مدوجزر اسلام کا تنقیدی جائزہ	(اردو)	ڈاکٹر ارشد سراج	۴
۳۔	عباس حیدر مضطرؔ جون پوری کی مرثیہ گوئی	ایک مطالعہ	ڈاکٹر ای اے حیدری	۱۰
۴۔	صاحبزادہ شوکت علی خاں ٹونک کی علمی و روحانی روایت کے گل سرسبد		شریف حسین قاسمی	۲۱
۵۔	تذکرہ شعرائے جے پور مولانا احترام الدین احمد شاغل عثمانی		ڈاکٹر رئیس احمد	۲۵
۶۔	ڈاکٹر حسن مثنیٰ عشقِ انیس		رئیس احمد جارچوی	۳۹
۷۔	فیض اور مخدوم		ڈاکٹر عزیز رضا	۴۴
۸۔	شیخ سنائی ایک تعارف	(اردو)	صاحبزادہ ڈاکٹر صولت علی خان	۵۴

ضیاءِ تصوف

(۱) بنی آدم کی نیک بختی اس میں ہے کہ ان کے اخلاق اچھے ہوں اور ان کی بدبختی اس میں ہے کہ ان کے اخلاق برے ہوں۔

(۲) اعتدال یعنی ہر کام میں افراط وتفریط نہ کرنا نبوت کا پچیسواں حصہ ہے۔

(۳) دولت میں میانہ روی کیا ہی عمدہ بات ہے، افلاس میں میانہ روی کیا ہی اچھا طریقہ ہے۔لوگو! میانہ روی اختیار کرو، میانہ روی اختیار کرو کیوں کہ اللہ نہیں تھکتا اور تم تھک جاتے ہو۔

(۴) لوگو وہی کام کرو جن کو کرنے کی تم طاقت رکھتے ہو، کیوں کہ خدا نہیں تھکتا ہے اور تم تھک جاتے ہو اور خدا کے نزدیک وہی عمل سب سے زیادہ مقبول ہے جو ہمیشہ جاری رہے، اگر چہ تھوڑا ہو۔

(۵) مسلمانو! لوگوں کو اسلام کی دعوت دو اور ان کو رغبت دلاؤ اور نفرت نہ دلاؤ اور ان کو آسان باتوں کی ہدایت کرو اور سخت کے احکام جاری نہ کرو۔

(۶) مسلمانو! جب تم لوگوں سے پروردگار عالم کا ذکر کرو تو ایسی باتیں نہ بیان کرو جن سے وہ خوف زدہ ہو جائیں اور ان کو شاق گزرے۔

(۷) مسلمانو! لوگوں کو ایسے کاموں میں مجبور نہ کرو جن کی وہ طاقت نہیں رکھتے کیوں کہ عمل وہی اچھا ہے جو ہمیشہ انجام پاتا رہے اگر چہ مختصر ہی کیوں نہ ہو۔

(۸) مسلمانو! خدا کی قسم، میں تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں تا ہم میں کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا کبھی نماز پڑھتا ہوں اور کبھی سو جاتا ہوں اور عورتوں سے تعلق بھی قائم کرتا ہوں پس جو کوئی میرے طریقے سے پھر جائے وہ میری امت سے نہیں ہے۔

(از روح الاسلام معروف بہ احادیث منتخبہ)

مسدس مد و جزر اسلام کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ارشد سراج
ایسوسی ایٹ پروفیسر
قائم مقام پرنسپل گورنمنٹ کالج باڑی دھول پور

سرسید کے ایماء پر مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس کی بنیاد ڈالی یہی مسدس بعد ازاں مسدس مد و جزر اسلام کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کی اشاعت نے مسلمانوں میں ایسی روح پھونک دی کہ قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ اس کی بندوں کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی۔

بقول شیخ اسماعیل پانی پتی یہ ماجون ۱۸۷۹ء مطابق جمادی الثانیہ ۱۲۹۶ھ میں چھپوایا، پہلا اور دوسرا ایڈیشن دونوں بلا ضمیمہ تھے، مسدس کے پہلے دونوں ایڈیشن ۲۹۷ بند اور ۱۸۹۱ اشعار پر مشتمل تھے۔ ۱۸۷۹ء میں جب مسدس کا پہلا ایڈیشن منظر عام پر آیا تو حالی نے اس کے پانچ نسخے سرسید کو ارسال کئے اس کے پڑھنے کے بعد ان کے دل و دماغ پر جو اثرات مرتب ہوئے اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''کہ جب خدا پوچھے گا کہ کیا لایا ہے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں''۔ اس کے بعد سرسید نے اس پورے مسدس کو اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' مطبوعہ ماہ شوال بابت ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۸۰ء کے شمارے میں شائع کیا تا کہ یہ تہذیب الاخلاق میں اشاعت کے بعد ملک کے طول و عرض میں پڑھا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اشاعت کے بعد ہی حالی کے خلاف ایک محاذ قائم ہو گیا اور مسدس کی صوری و معنوی خامیوں پر لے دے شروع ہو گئی، حتیٰ کہ حالی کی شخصیت اور سیرت کو بھی موردِ الزام قرار دیا گیا۔ چناں چہ اغیار کے طعنوں اور دوستوں کے مشورہ کے سبب حالی اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسدس کا اختتام قنوطیت کے بجائے جائیت پر ہونا چاہئے تھا، اس خیال کے پیش نظر حالی نے مسدس پر نظر ثانی کر کے اس کے لفظی اور معنوی سقم کو دور کی اور جن بندوں پر مسدس کا اختتام ہوتا تھا۔ اس کے بعد ۱۶۲ بندوں کا مزید اضافہ کر دیا۔ اس اضافے کو انہوں نے ''ضمیمہ'' کا نام دیا۔ یہ ضمیمہ حالی کے ''اقتضائے حال'' کے موافق تھا۔ ضمیمہ کے علاوہ حالی نے ۱۶۳ اشعار پر مشتمل ایک ''مناجات'' بھی لکھی جسے انہوں نے عرضِ حال کے عنون سے مسدس میں شامل کیا۔ اس کے علاوہ حلالی نے قدیم مسدس یعنی اشاعتِ اول میں بھی جستہ جستہ تصرف کیا تھا۔ اس اعتبار سے مسدس حالی کی یہ اشاعت حد درجہ معنی خیز تھی۔ بعد کے تمام ایڈیشن اس نسخے پر مبنی ہیں۔

اب ہمیں مسدس حالی کے اشعار کے حوالوں سے ان تمام امور کی نشان دہی کرنی ہوگی جو اپنے آپ میں تعمیری ہیں۔

مسدس حالی کے غائرانہ مطالعہ سے معلوم ہوتا کہ یہ طویل قومی نظم بنیادی طور پر ماضی، حال اور مستقبل تین حصوں میں منقسم ہے اوراس کا ہر حصہ مختلف عنوانات سے مزین کیا گیا ہے۔ ''حصۂ ماضی'' کی پانچ سات تمہیدی بندوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حالی مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کو دور کرنے کے فکرمند ہیں۔ اور وہ مسلمانوں کو اس زبوں حالی کا احساس دلانا چاہتے ہیں کہ یہ پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے ہیں، اس نظم کا بنیادی مقصد تمہید کے اس شعر میں مضمر ہے ۔

کل کون تھے آج کیا ہوگئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سوگئے تم

دراصل یہی ''مسدس حالی'' کا بنیادی رجحان ہے۔ جو درج بالا شعر میں ظاہر ہوا ہے، اور مسدس حالی کے حصۂ ماضی (کل کون تھے) اور حصۂ حال (آج کیا ہوگئے) میں پھیلا ہوا ہے۔ تمہیدی بندوں کے بعد حالی نے نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب کی اخلاقی، معاشرتی، مذہبی اور سماجی زبوں حالی کا نقشہ بڑے ہی موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے اور مسلمانوں کو یہ احساس دلایا ہے کہ جب اہل عرب کی تباہی اور بربادی حد تجاوز کر گئی تو خدائے تعالی کی رحمت جوش میں آئی اوراس نے اپنی مخلوق کو گمراہی سے بچانے کے لیے وہ پیشین گوئی پوری کی جس کی شہادت انبیائے سابقین دیتے چلے آئے تھے، یعنی اس مقدس ترین ہستی کو جو فقیروں کا ملجا اور یتیموں کا والی ہے خدا نے اسے تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا، جس نے اپنی سیرت اور کردار سے عرب کی کایا پلٹ کر دی، یعنی کہ ''اسلام کے رخ روشن پر زمانے کے تعصّبات، مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہ روی کی وجہ سے جو پردہ پڑ گیا تھا، حالی نے اس پردے کو اٹھا کر دکھایا کہ اسلام ایک مذہب امن ہے جو دنیا میں سلوک اور محبت کی حکومت قائم کرنے آیا تھا، اسلا کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف کو مٹانا اور ان میں محبت کی حکومت قائم کرنے آیا تھا، اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف کو مٹانا اور ان میں ایک عالمگیر اخوت قائم کرنا تھا............اس کی برکت سے مسلمانوں نے دنیائے فکر وعمل کو مسخر کر لیا تھا۔

حالی مزید لکھتے ہیں کہ نبی برحق کی تعلیمات کا ایسا اثر ہوا کہ ان کی رحلت کے بعد مسلمانوں نے ساری دنیا میں امن ومساوات کا پرچم لہرایا، قیصر وکسریٰ کے ایوانوں میں اذانوں کی صدا سنائی دینے لگی علاوہ ازیں مسلمانوں نے علوم وفنون کے ایسے دریا بہائے کہ ساری دنیا نے ان سے کسب فیض کیا روئے زمین کے کونے کونے میں انہوں نے اپنی فتوحات کے نقوش چھوڑے۔ اندلس، غرناطہ، بلنسیہ اور قرطبہ میں مسلمانوں کے قصر شاہی اور آثار صنادید اسلام سے آج بھی مسلمانوں کی عظمت اور شان وشوکت ٹپکتی ہے مثلاً یہ بند ملاحظہ ہوں ۔

لیے علم وفن ان سے نصرانیوں نے کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے کہاں بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے

ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر
جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر

جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جاکر
یہ ہے بیت حمرا کی گویا زباں پر

کہ تھے آل عدنان سے میرے بانی
میں ہوں اس زمین میں عرب کی نشانی

نہیں اس طبق پر کوئی بر اعظم
نہ ہوں جس میں ان کی عمارات محکم

عرب، ہند، مصر، اندلس شام ویلم
بناؤں سے ہے ان کی ، معمور عالم

سر کوہ آدم سے تا کوہِ بیضا
ملے گا جہاں جاؤ گے کھوج ان کا

دراصل حالی نے مسدس میں تاریخ اسلام جو شاہنامہ پیش کیا ہے وہ ایک ایسا سنگ بنیاد بنا کہ جس پر بعد میں ''اقبال'' نے اپنی شاعری کی بنیاد قائم کی۔حالی نے تاریخ اسلام کے ذریعے سے مسلمانوں کی ان کی گذشتہ عظمت کا احساس دلایا تا کہ وہ پھر اپنی سنہری ماضی کے تاروپود سے دوبارہ اپنے لیے ایک خوب صورت مستقبل کی جدوجہد کریں۔

مولانا حالی مسدس کے پہلے حصہ (ماضی) میں عروج اسلام کی تصویر پیش کرنے کے بعد نظم کے دوسرے حصہ یعنی ''حال'' میں مسلمانوں کی اقتصادی، اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی پسماندگی کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالتے ہیں، جس کا احساس انہیں علی گڈھ تحریک کے زیر اثر ہوا تھا، کہ عزیز ذلیل ہورہے ہیں شرفاء برباد ہو چکے ہیں، علوم وفنون سب قوم سے غائب ہوتے جا رہے ہیں، غربت اور افلاس گھروں پر طاری ہے۔علاوہ اس کے علماء دین پیر ومشائخ جو مسلمانوں کی اصلاح کے ذمہ دار ہیں زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں سے نابلد اور آشنا ہیں، اخلاقی قدریں سب پائمال ہورہی ہیں حالی کے خیال میں مسلمانوں کی پسماندگی کا اصل سبب اہل اللہ، علمائے دین اور دینی علوم کا قحط ہے البتہ کچھ نام نہاد علماء اور درویش موجود ہیں، جن کا مقصد صرف تحصیلِ دولت ہے۔ایسے علماء کو دین ومذہب اور ملتِ اسلامیہ سے کوئی سروکار نہیں یہاں ہمیں حالی کا نقطۂ نظر سرسید سے مختلف نظر آتا ہے، کیوں کہ سرسید کے یہاں مغربی رجحانات ہی اصل منزل ہیں اور وہ مسلمانوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے، جب کہ حالی مسلمانوں کے زوال کی اصل وجہ اسلام کی خالص قدریں قبول کرنے سے گریز بتاتے ہیں۔انہوں نے مسدس میں'' الدین یسر'' کی آواز بلند کر کے

مسلمانوں پر یہ بات ثابت کی ہے کہ ان کا مذہب کسی بھی طرح دنیاوی ترقیات میں مانع نہیں ہے وہ دین اور شریعت کی پابندی کرتے ہوئے بھی ترقی کے میدان میں آگے ہو سکتے ہیں مثلاً یہ بند دیکھئے۔

شریعت کے احکام تھے وہ گوارا | کہ شیدا تھے ان پر یہود ونصاریٰ
گواہ ان کی نرمی کا قرآں ہے سارا | خود ''الدین یسر'' نبی نے پکارا
مگر یاں لیا ایسا دشوار ان کو
کہ مومن سمجھنے لگے بار ان

نہ کی ان کی اخلاق میں رہنمائی | نہ باطن میں ان کے پیدا صفائی
یہ احکام ظاہر کی لے یہ پڑھائی | کہ ہوتی نہیں ان سے دم بھر رہائی
وہ دیں جو کہ چشمہ تھا خلق نکو کا
کیا اس کو بالوعہ غسل خانہ ووضو کا

حالی مسلمانوں میں پیدا شدہ برائیوں مثلاً غیبت، حسد وتکبر، خبث النفس، فتنے انگیزی اور خوشامد کو ان کی اخلاقی پستی کا موجب قرار دیتے ہیں اور ہمسایہ قوموں کے عروج اور رفتار زمانہ کا احساس دلا کر مسلمانوں کو ان برائیوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چناں چہ اس نظم کے اس حصہ کے اختتام پر ''برکات حکومت'' نیز تجازت کے وسائل، ریل، ڈاک اور تار کی بھرپور تعریف کرتے ہیں، تا کہ مسلمان بھی زمانے کی صنعتی ترقی میں آگے قدم رکھ سکیں اور حکومت کی طرف سے دی گئی صنعتی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں مثلا

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں | نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں | تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق اور رہزن کا کھٹکا

چوں کہ حالی نے مسدس کے دوسرے حصہ (حال) میں مسلمانوں کی خرابیاں چن چن کر بیان کی تھیں اور زبان سے تیغ وسنان کا کام لیا تھا مگر یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اسی قدر مایوس کن بھی تھا اس لیے حالی کو اس سقم کا احساس ہوا اور انہوں نے مقتضائے حال کے موافق اس کے آخر میں ایک ''ضمیمہ'' بھی شامل کیا۔ تا کہ اس کی شمولیت قوم کے لیے حوصلہ افزاء ثابت ہو اور مسلمانوں کی مایوسی کا طلسم بھی ٹوٹ جائے گا۔

مسدس کے تیسرے حصہ یعنی ضمیمہ سے متعلق بندوں کو حالی نے مختلف عنوانات سے مزین کیا مثلاً امیر، غریب، قوی، امکانِ

ترقی وآغاز ترقی،اقبال مندی کیا چیز ہے محنت پسندی،کاہلی،مذمت شرافت محنت غمخواری نئی نوع رغبتِ علوم وفنون،فضیلت علم،علوم جدیدہ نے نتائج،ہمتِ مرداں،زمانہ گذشتہ میں تعلیمی کوشش وغیرہ وغیرہ ''ضمیمہ'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حالی نے مسلمانوں کو امید ویقین،حرکت وعمل اورعزم وحوصلہ قائم رکھنے کی تلقین کی ہے کیوں کہ بقول حالی مسلمانوں میں ابھی احساس زیاں باقی ہے اس میں ابھی خودداری،غیرت وحمیت،آن بان،ہمدردی وغم گساری اوراخوت کے جذبات فنا نہیں ہوئے ہیں اس لیے اگر چہ یہ ذرا عزم وحوصلے سے کام لے تو از سرنو اپنی کھوئی ہوئی شان وشوکت اوروقار کوحاصل کرسکتی ہے یعنی ع

ذرانم ہوتو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی،

چناں چہ حالی کہتے ہیں۔

بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی دلیری نہیں پر حمیت ہے باقی
فقیروں میں بھی بوئے ثروت ہے باقی تہی دست ہیں پر مروت ہے باقی
مٹے پھر بھی پندار ہستی وہی ہے
مکاں گرم ہے آگ گو بجھ گئی ہے

اس کے علاوہ حالی ضمیمہ میں قوم پر چھائی ہوئی کاہلی کی سخت مذمت کرتے ہیں اوراز سرنو انہیں کوشش ومحنت کے رغبت دلاتے ہیں کیوں کہ حالی کے خیال میں کسی بھی قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ محنت وکوشش اور جدوجہد سے گریز نہ کرے۔علاوہ ازیں مسلمانوں کی ترقی تحصیل تعلیم سب سے زیادہ اہم اورضروری ہے لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوں کیوں کہ بقول حالی ۔

جنہوں نے تعلیم کی قدر وقیمت نہ جانی مسلط ہوئی ان پہ ذلت
ملوک اور سلاطیں نے کھوئی حکومت گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت
رہے خاندانی نہ عزت کے قابل
ہوئے سارے دعویٰ شرافت کے باطل

حالی نے ضمیمہ کے اختتام پر ۶۳ راشعار کی ایک التجا بھی پیش کی ہے یہ التجا بارگاہِ رسول میں مسلمانوں کی ابتری کا حال بیان کرتے ہیں اوررحمتِ عالم سے امداد کے ملتجی ہوئے ہیں،تا کہ رسول کی امت تاریکی اورتنزلی سے نکل کر ترقی کی راہ اختیار کرسکے مثلاً ملاحظہ ہو۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

مسدس ومد وجزر اسلام کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حالی نے اس میں ایسی زبان استعمال کی ہے جو عام فہم ہے اور اس کے علاوہ میلے ٹھیلوں اور گلی کوچوں اور چوپالوں کی زبان ہے، حالی نے اس میں ایسے محاوارت کا استعمال کیا ہے جو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا خاصہ ہیں جنہیں پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جیسے زمین سے چنے گئے ہوں اس لیے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مسدس حالی کی زبان و بیان میں ایک عوامیت اور عرضیت موجود ہے، مسدس کے اس مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک صور تھا جسے خدا نے حالی سے پھونکوایا تھا۔ اور جس کی سحر آفرینی سے قوم میں بیداری پیدا ہوئی اور اپنے امراض کا صحیح علم ہوا۔ نتیجتاً یہ نظم جتنی خواص کو مرغوب ہوئی اتنی ہی عوام کو عزیز ہوئی، اور اسی لیے اسے اردو شاعری میں پہلی قومی نظم کے نام سے موسوم کیا گیا۔

☆☆☆☆☆

عباس حیدر مضطرؔ جون پوری کی مرثیہ گوئی ایک مطالعہ

ڈاکٹر ای اے حیدری
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو
گورنمنٹ لوہیا کالج چورو

ماسٹر عباس حیدر مضطرؔ جون پوری کو بحیثیت شاعر اس وقت سے جانتا ہوں جب میرا ادبی شعور سن بلوغت تک بھی نہیں پہنچا تھا۔ ہمارے آبائی مکان باغ گھاسی وزیر گنج کی پشت پر روشن علی مرحوم کے وارثوں کا جو مکان ہے اس میں احمد علی عابدی مرحوم لیکچرر فارسی و دینیات حسین آباد انٹر کالج کے ورثہ مقیم تھے ان کے جانے کے بعد ماسٹر عباس حیدر صاحب آئے۔ ابتداء میں صرف یہ علم ہوا کہ شیعہ انٹر کالج میں حساب کے لیکچرر ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ۱۸/ذی الحجہ عید غدیر کے سلسلے کی ایک طرحی محفل موصوف نے اپنے مکان پر منعقد کی تو ایک اور جوہر کھلا کہ جناب شاعر بھی ہیں لیکن یہ اجتماع ضدین میرے لئے حیرت کا کم اور خوشی کا سبب زیادہ تھا

اس طرحی محفل کا سلسلہ قیام وزیر گنج اور بعد کو مفتی گنج میں تا حال جاری ہے۔ ہر چند کہ مفتی گنج میں شرکت کا کبھی اتفاق نہ ہو سکا مگر وزیر گنج میں کبھی شرکت نہ کی ہو ایسا مجھے یاد نہیں۔ اس محفل میں مقامی شعرائے کرام میں بیشتر اساتذۂ فن اور بیرونی شعراء میں زیادہ تر جون پور کے وہ شعراء جو رضاؔ جون پوری کے حلقۂ اثر میں تھے شرکت کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں ساجدؔ زید پوری کی رہ نمائی میں شعر موزوں کرنے لگا تھا اور لکھنو کے مسالموں اور مقاصدوں میں شرکت بھی کرنے لگا تھا۔ مضطرؔ جون پوری کے گھر کی اس محفل کے مصرعے اکثر بہت پہلے معلوم ہو جاتے تھے پھر بھی ان پر کبھی طبع آزمائی کی ہمت نہ کر سکا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میرے حلقۂ احباب میں جتنے بھی نوجوان مولویان کرام فن شاعری میں طبع آزمائی کر رہے تھے ان کے درمیان لکھنو کی کئی طرحی محفلوں اور مسالموں کے لئے یہ مشہور تھا کہ ع

یہاں دیتے ہیں مصرعے امتحاں والے

لکھنو کی ایسی ہی امتحان والی طرحی محفلوں میں عباس حیدر مضطرؔ جون پوری کو نہ صرف شرکت کرتے دیکھا ہے بلکہ میر محفل وصدر مقاصدہ بنتے بھی دیکھا ہے۔ انہیں سنگلاخ ترین زمینوں میں مدح کے وہ گل کھلاتے دیکھا ہے جن سے سامع کی مشام عقیدت معطر ہوئے بغیر نہیں رہتی ذیل میں ان کے قصیدے کے مجموعے انوار کساء سے کچھ شعر آپ کی نذر ہیں

سیدہ عالمیان جناب فاطمہ زہرا کی منقبت کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

نقش سجدہ بن گئیں تزئین چادر ہو گئیں — آیتیں قرآن کی زہرا کو زیور ہو گئیں
دل کو ایسا ربط تھا معبود کی تسبیح سے — آپ جزو طاعت خلاق اکبر ہوگئیں
باپ محبو ب خدا اور بیٹے سردار جناں — افتخار ذات مریم کفو حیدر ہو گئیں

مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی منقبت کے درج ذیل اشعار بھی دیکھئے جن میں مضطؔر کی زبان و بیان ،فکروفن ،لہجہ واسلوب کی تازہ کاری کے جوہر اپنی مکمل آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں

خطبوں سے علی کے خالق کے فرمان کی خوشبو آتی ہے — جب نہج بلاغہ پڑھتا ہوں قرآن کی خوشبو آتی ہے

جن کو علی کے نقش قدم سے ضیاء ملی — کونین میں چراغ وہی ضو فشاں رہے
انجام اس کا کیا ہے یہ کعبہ سے پوچھئے — خالی اگر مکین سے کوئی مکاں رہے
آجائے آج وارث حیدر جو عرش سے — مٹ جائے ظلم دہر میں امن و اماں رہے
مضطر انہی کے نام کا صدقہ ہے زندگی — مدحت میں جس علی کی زمین و زماں رہے
غذائے خلد سے بہتر ہے تیری نان جویں — فرشتے آتے ہیں در پر ترے بہ شکل فقیر
ہیں مولوی کی قیادت میں راہ زن اکثر — یہ بیچ کھاتے ہیں اوقاف قوم کی جاگیر
علی کا بغض تو ہے کفر عشق ہے اسلام — یہ قول وہ ہے کہ جس پر جلا غدیر سے ہے
دلوں میں بغض علی لب پہ کلمۂ توحید — عداوتوں کا عجب سلسلہ غدیر سے ہے
نفس نفس میں ہے مضطؔر غدیر کا منظر — مرے کلام میں سارا مزا غدیر سے ہے
علی کی ذات مصدر امامت عظیم ہے — علی کا جو کلام ہے وہ نازش کلیم ہے
ولایت علی ہی بس وہ نعمت نعیم ہے — کہ جس کے دم سے رونق صراط مستقیم ہے
قدم قدم ہے حق نما امام حق مدار کا
پہاڑ بھی خراج دے یہ ایسا بردبار ہے — نبی کے بعد دین کی بقا کا ذمہ دار ہے
کلام کیا سکوت بھی رضائے کردگار ہے — گلے میں ریسمان ہے کمر میں ذوالفقار ہے
ذرا یہ صبر دیکھئے شریف روزگار ہے
زمین پہ عرش سے جبرئیل پڑھنے آتے ہیں — علی کے علم کی کونین پر حکومت ہے

بتا رہا ہے یہ مرضی سے نفس کا سودا | کہ ہم مزاج علی کا مزاج قدرت ہے
ظرف سراب خشک ہے پانی نہ پاؤگے | غیروں میں لافتیٰ کی جوانی نہ پاؤگے
قدرت کی یہ عظیم نشانی نہ پاؤگے | حیدر کا کوئی دہر میں ثانی نہ پاؤگے
دامن پکڑ لو ان کا اگر خوف نار ہے

ذیل میں امام حسن کی شان میں مخمس کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے

حب عترت کی جو مئے سے دہر میں سرشار ہے | رہ نما اس کی حیات میثم تمار ہے
جس کے سینے میں خلوص بوذر و عمار ہے | جس کے قبضے میں ولائے آل کی تلوار ہے
زندگی اس کی کبھی ناکام ہو سکتی نہیں

صلح فرمائی حسن نے اک نئے انداز کی | توڑ دی قوت سیاست کے پر پرواز کی
ہوگئی واضح حقیقت سلطنت کے راز کی | دھجیاں کیا کیا اڑیں دامان بدعت ساز کی
فکر خاطی شامل اسلام ہو سکتی نہیں

ان کی صورت مصطفیٰ ہے ان کی سیرت مصطفیٰ | یہ بہ حرمت مصطفیٰ ہیں یہ بہ عزت مصطفیٰ
یہ بہ حکمت مصطفیٰ ہیں یہ بہ عادت مصطفیٰ | دین کی مشکل میں ہر وقت ضرورت مصطفیٰ
مصلحت ان کی خیال خام ہو سکتی نہیں

اوراب سرکار شہادت امام حسینؑ کی شان میں مضطر جون پوری کے یہ اشعار بھی دیکھئے جن میں تاریخ وحدیث کا خوبصورت امتزاج موجود ہے

کیوں نہ پھر مرسل کا سجدہ حاصل معراج ہو | جلوہ فرما بر سر مہر نبوت ہیں حسین
لفظ منی و انا سے یہ بھی ثابت ہو گیا | مصطفیٰ آغاز، تکمیل رسالت ہیں حسین
یہ کمال مدحت شبیر ہے | فکر میری کہکشاں تنویر ہے
جب جھکی آنکھیں زیارت ہو گئی | میرے دل میں روضۂ شبیر ہے

عموماً شعراء حضرات پنجتن پاک کی مدح میں ہی اپنی فکر کے جوہر دکھاتے ہیں۔ بہت کم شعراء ایسے ہیں جنہوں نے چہاردہ معصومین کی مدح میں طبع آزمائی کی ہے اس لئے کہ یہاں مدحیہ شعر کہنے کے لئے جس وسیع مطالعے اور فنی مہارت کی ضرورت ہے اس سے اکثر عاری دکھائی دیتے ہیں مضطر جون پوری کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے جو ان کی فکر جوہر کو بخوبی نمایاں کرتے ہیں

سید سجاد امام زین العابدینؑ کی مدح کے یہ شعر دیکھئے

قید ہیں پھر بھی اشاروں پر رواں ہے کائنات ہاتھ میں ساری خدائی پاؤں میں زنجیر ہے
مرضیٔ داور ملی سجدوں کی قیمت دیکھئے اک مریض ناتواں بھی شافع محشر بنا

دسویں معصوم امام علی رضا کی ثنا مضطر نے جس طرح سہل ممتنع میں کی ہے وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ذیل کے یہ دو شعر دیکھئے

جا کے پوچھو صاحب معراج سے تب سمجھ میں آئے گی شان رضا
پھر عطا اذن حضوری ہو مجھے دیکھوں پھر اک بار ایوان رضا

ذیل میں امام محمد تقی جواد کی مدح کا یہ انداز بھی ملاحظہ کیجئے جس میں انہوں نے تاریخی واقعات کی مدد سے عظمت امامت اجاگر کرنے کی سعی کرتے ہوئے اپنی عقیدت واحترام کے دوش بدوش اپنی فکری وفنی صلاحیتوں کے جوہر بھی نمایاں کئے ہیں

ہو کوئی مسئلہ بھی پر اس کے جواب میں آیت تری زبان پہ قرآن ہی کی ہے
ہے کائنات آپ کی نظروں پہ بے حجاب ادنیٰ صفت یہ آپ کی دیدہ وری کی ہے

امام زمانہ کی مدح کا یہ انداز بھی دیکھئے جس میں صنعت تضاد کے ذریعے مدح کے پہلو کو اجاگر کیا ہے

کوئی بجھا نہ سکے گا چراغ پھونکوں سے خزاں کا دور ہے لیکن بہار قائم ہے
حق آئے گا جب ظلم سے بھر جائے گی دنیا جس طرح سے ہر شام کے بعد ایک سحر ہے
اے پردہ نشیں تیری ضرورت ہے جہاں کو جو امن کی بستی تھی وہ معمورۂ شر ہے

ذیل میں ان کے ایک اور قصیدے کے اشعار اور مخمس کے بند بھی دیکھئے

جو فضیلت کے ہیں منکر وہ کلام حق میں عترت پاک کی سیرت کا خلاصہ دیکھیں
گلشن حضرت نرجس میں بہار آئی ہے نو عروسان چمن آ کے نظارہ دیکھیں
ذات قائم میں کمالات سلف کے منکر حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا دیکھیں
خضریٰ سے جب آئے گا خورشید ہدایت کا جلوہ نظر آئے گا ہر سمت شریعت کا
سکہ وہ چلائے گا دنیا میں عدالت کا انداز نیا ہوگا گہوارۂ فطرت کا
ہم دیکھیں گے دنیا کو فردوس بہ داماں ہے

مرحلے ہوجائیں گے طے عاشقوں کے دیکھنا　　کھنچ کے سب آجائیں گے دریا کنارے دیکھنا
طالبان دید کے میلے لگیں گے دیکھنا　　ایک رخ میں چودہ معصوموں کے جلوئے دیکھنا
عسکری کا لال جب پردے کے باہر آئے گا

مذکورہ اشعار ان کے مجموعہ قصائدانوار کساء سے بغیر کسی کاوش کے درج کئے ہیں۔اس میں چہاردہ معصومین کے علاوہ حضرت عباس وثانیٔ زہرا جناب زینب کی مدح میں کل ۵۶ قصائد ہیں جن میں سے ۲۷ مخمس کی ہیئت میں ہیں اس سے اس یہ حقیقت بخوبی آشکار ہوتی ہے کہ مضطرؔ جون پوری کو مدح ومنقبت کے لئے غزل کی ہئیت کے بعد اگر کوئی ہیئت نہایت موزوں معلوم ہوتی ہے تو وہ مخمس ہے

انوار کساء کے آخری حصہ میں کچھ قطعات ورباعیات بھی شامل ہیں جن سے ان کی شعری مہارت وہنرمندی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

انوار کساء کے بعد مضطرؔ جون پوری کا ایک اور مجموعہ جہاد کربلا کے عنوان سے ۲۰۱۴ء میں ہی منظر عام پر آیا ہے اس مجموعہ کی ابتداء میں محترم تجسّسؔ اعجازی، ڈاکٹر عظیم امروہوی، ڈاکٹر ناشرؔ نقوی امروہوی کے علاوہ استاد محترم خطیب اکبر پروفیسر مرزا محمد اطہر صاحب قبلہ دام مجدہ کے پرمغز مقالے ہیں جن میں مذکورہ بالغ نظر نقادوں نے مضطرؔ جون پوری کی فکری وفنی خوبیوں کی تفصیلی نشان دہی کی ہے

جہاد کربلا میں پانچ مرثیئے،نوسلام، چودہ قصائد اور آخر میں پانچ رباعیات شامل ہیں

مضطرؔ جونپوری کے یہ مرثیئے اس دور کی یادگار ہیں جب وہ فکروفن کے اعتبار سے پختہ کار ہو چکے ہیں اور قصیدہ ومنقبت کی دنیا میں اپنی ایک شناخت قائم کر چکے ہیں۔قصیدہ گوئی ومنقبت کے نتیجے میں شکوہ الفاظ کی وہ کیفیت جو قصیدہ ومنقبت سے مخصوص ہے لاشعوری طور پر ان کے مرثیوں میں بھی جھلک جاتی ہے اور یہ مضطرؔ جون پوری کا نقص نہیں اس لئے کہ جب کوئی شاعر یا ادیب کسی مخصوص صنف کی خدمت میں عرصۂ دراز تک مصروف رہتا ہے تو اس کا اثر لاشعوری طور پر دوسری اصناف پر بھی پڑتا ہے چنانچہ ان کے مرثیوں میں بھی آپ کو الفاظ کی بندش، تراکیب وعلامات وغیرہ کا وہی انداز نظر آئے گا جو ان کے قصیدے ومنقبت کا طرۂ امتیاز ہے مثال کے طور پر ان کے مرثیوں کے درج ذیل بند ملاحظہ کیجئے

اے کربلا فروغ دہِ امتحان ہے تو　　خاک زمیں پہ گلشنِ جنت نشاں ہے تو
تاج سرِ کمالِ بشر بے گماں ہے تو　　بالا جو آسماں سے ہے وہ آستاں ہے تو

اکسیر تیری گردِ رہِ کارواں بنی
تیرے قدم کو چھو کے زمیں آسماں بنی

تیرا ہر ایک ذرہ ہے شمعِ حریمِ ناز — تو ہی غازہ بخش رخِ شاہدِ نیاز
بے شبہ تو ہے بوسہ گہِ کعبہ ٔ حجاز — ہے محوِ خواب تجھ پہ وہ مردِ عمل نواز
جس کی صدا تھی ہر بد بہتر کے سامنے
کٹ جائے سر مگر نہ جھکے شر کے سامنے

والعصر اس کا عصر میں کوئی نہیں جواب — ہے والضحیٰ اسی سے ضیاء بخش آفتاب
ہے والقمر یہی مہِ تابانِ انقلاب — ہے مرکزِ کمال یہی آسماں جناب
اس کا نہ کوئی مثل نہ کوئی نظیر تھا
یہ حافظِ کتابِ خدائے قدیر تھا

مضطرؔ جون پوری کے مجموعۂ مراثی پرنظر کرنے کے بعد بادی النظر میں قاری کے ذہن میں یہی تأثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ روایتی مرثیئے ہیں اس لئے کہ ان میں سے ایک کے علاوہ باقی چاروں مرثیئے عنوان سے خالی ہیں اوران میں کلاسیکی مرثیئے کے اجزائے ترکیبی بھی موجود ہیں یعنی فنی روایت کی مکمل پابندی کا نمونہ ہیں مگراس کے باوصف یہ روایتی نہیں کہے جاسکتے اس لئے کہ موضوع جدید ہے، پیش کش میں اسلوب بھی جدید اختیار کیا گیا ہے مثال کے طور پران کے یہ بند دیکھئے

اے چراغ ضوفشاں محفل ارض و سما — تو ہی وہ رہبر ہے جو ہے منزلوں سے آشنا
درمیانِ بندہ و معبود تو ہے رابطا — پالیا جس نے بھی تجھ کو مل گیا اس کو خدا
حریت کا صبر کا ایثار کا پھر جام دے
آکے دنیا کو حیات تازہ کا پیغام دے

ہاتھ کفر و شرک کا پھر بڑھ رہا ہے بار بار — آ، گریبان شریعت ہو رہا ہے تار تار
آ، فقیروں اور غریبوں کو ہے تیرا انتظار — آ کہ مزدوروں میں پیدا ہو گیا ہے انتشار
ہو رہے ہیں عظمت آدم پہ حملے رات دن
دم بخود بیٹھے ہیں نیکی کے فرشتے رات دن

جنبشِ لب سے عیاں قرآن کی تفسیر ہے — دست موسیٰ کی تجلّی تیری ہی تنویر ہے

کچھ نہیں ہے خلد ادنیٰ اک تری جاگیر ہے　　کل ایماں کی قسم حق کی تو ہی تصویر ہے
کشتی دین محمد کو کنارا مل گیا
تو ہی وہ ہے جس سے عالم کو سہارا مل گیا

مضطرؔ جون پوری کے نزدیک زندگی مقصد وعمل سے عبارت ہے اسی لئے ان کے یہاں مرثیوں میں سراپا نگاری کے بجائے سیرت و کردار کے پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش بدرجۂ اتم موجود ہے۔انہوں نے سیرت و کردار کے بکھرے ہوئے مرقعوں کو جستہ جستہ اپنے مرثیوں میں پیش کیا ہے مضطرؔ جون پوری کے یہاں سراپا کے بجائے یہ سیرت نگاری کا عنصر اس لئے در آیا ہے کہ اس کے ذریعے بگڑی ہوئی اخلاقی، معاشرتی اور سماجی صورت حال کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے

قصر ثبات کا ہے تو وہ ضو فشاں چراغ　　تاباں ہے جس کے نور سے ایمان کا دماغ
سر سبز تیرے خوں سے ہے علم و عمل کا باغ　　جینے کا بعد مرگ تجھی سے ملا سراغ
پیغمبرانِ دہر کے دل کا سکون ہے
تیری رگوں میں حیدر صفدر کا خون ہے

آزادیٔ ضمیر کی دنیا کا شاہ کار　　ملک وفا و ہمت و جرأت کا تاج دار
صبر ذبیح و حلم محمد کا ورثہ دار　　کہتی ہے تیرے واسطے تاریخ بار بار
نورِ نگاہِ فاتحِ بدر و حنین ہے
تو وہ ہے جس کا اسم گرامی حسین ہے

لیجئے نماز عصر بھی حضرت نے کی ادا　　ہوتا ہے سر حسین کا گردن سے اب جدا
ہلتے ہیں لب حضور کے فرما رہے ہیں کیا　　ذاکر سے سنئے اب تو ہے سر پیٹنے کی جا
خنجر تو آہ حلق امام زماں پہ ہے
لیکن دعائے بخشش امت زباں پہ ہے

مضطرؔ جون پوری کے یہاں نکتہ رسی اور الفاظ کے انتخاب وترتیب میں خلاقانہ جوہر کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان کے مراثی کے اکثر مصرعے ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں ان کے یہاں موضوعات میں جدت و ندرت ،اشاراتی و علاماتی اسلوب اور ڈرامائیت کی وہ کیفیت موجود ہے جس میں خیر وشر کے درمیان رونما ہونے والے تنازعات کی عکاسی کی گئی ہے، وہ اپنے مراثی میں

ندرت وشگفتگی پیدا کرنے کے لئے اکثر وبیشتر صنائع لفظی ومعنوی سے بھی کام لیتے ہیں۔وہ جس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اسے دلیل وبراہین کے ساتھ واضح کرتے ہیں اور رثائیت کے بیان میں بھی معتدل ومتوازن انداز اختیار کرکے سوز وگداز کے پہلو پیدا کرتے ہیں

انہوں نے اپنے اس مرثیہ میں عہدرسالت سے تاراجی خیام امام حسینؑ تک کے اہم واقعات کو تاریخی صحت کے ساتھ نظم کرتے ہوئے قرآن کی آیتوں سے استفادہ بھی کیا ہے اور کچھ قرآنی آیات نظم بھی کی ہیں ان کے اس مرثیہ کے رثائی حصہ میں بھی انہوں نے تاریخی صحت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے مثال کے طور پر ان کے مختلف مرثیوں کے درج ذیل بند دیکھئے

جو جلوہ گاہِ سیرت مرسل تھا وہ حسین ایثار کا جو جوش مسلسل تھا وہ حسین
جو فوج بندگی کا ہراول تھا وہ حسین گویا جو حق کی وحیٔ منزّل تھا وہ حسین
یہ کیوں کہوں کہ جان و دل بوتراب تھا
کہتی ہے نص کہ جزو رسالت مآب تھا

جو صبح رہبری کا اجالا تھا وہ حسین کشتی کو جس نے دین کی سنبھالا تھا وہ حسین
ظلمت سے جس نے حق کو نکالا تھا وہ حسین رتبہ میں جو فلک سے دو بالا تھا وہ حسین
یکتا تھا جو جہاں میں شہِ بدر کی طرح
روشن ہے جس کا نام شبِ قدر کی طرح

ہیں ترے تابع زمین و آسماں ماہ و نجوم ارض سے تا آسماں تیرے فضائل کی ہے دھوم
کشت باطل کے لئے تیری نظر باد سموم ہے تری ہی فکر سے سر گرمیٔ بحر علوم
جذب ہے تیرا پسینہ جادۂ تسنیم میں
راز مضمر ہے ترقی کا تری تعلیم میں

آسمان عزم حریت کے مہر ضوفشاں ہے کلید قفل راز دانش کون و مکاں
تونے کھولے کشتیٔ ایماں و دیں کے بادباں کردیا تونے بلند اسلام مرسل کا نشاں
دھجیاں تونے اڑائیں جامۂ الحاد کی
زیب و زینت تجھ سے ہے ہر عالم ایجاد کی

اے چراغ ضوفشاں محفل ارض و سما — تو ہی وہ رہبر ہے جو ہے منزلوں سے آشنا
درمیان بندہ و معبود تو ہے رابطا — پالیا جس نے بھی تجھ کو مل گیا اس کو خدا
حریت کا صبر کا ایثار کا پھر جام دے
آکے دنیا کو حیات تازہ کا پیغام دے

ہوتی نہ ان کی ذات تو کھلتا نہ حق کا راز — ہے ان کی ذات مذہب و ملت کی کارساز
قائم ہے ان کے سجدے سے شیرازۂ نماز — ہے بندگی سے ان کی عیاں شان بے نیاز
روشن انہیں کے سجدوں سے خالق کی راہ ہے
باقی صدائے اشہد ان لا الہ ہے

خطرہ کی زد پہ جب کہ وجود کتاب تھا — چھایا ہوا سروں پہ ستم کا سحاب تھا
آنکھوں میں میرِ شام کی بیعت کا خواب تھا — ہونے کو بند قصر شریعت کا باب تھا
باطل کے ہاتھوں دین کی حالت خراب تھی
انسانیت اسیر تماشائے خواب تھی

ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی تاریکئ ضمیر — فرعون کی شبیہ تھا ہر اک جوان و پیر
بنت العنب کے دام میں تھی سلطنت اسیر — ڈوبا ہوا تھا نشہ میں خود ساختہ امیر
قول نبی کا پاس نہ قرآں سے عشق تھا
ابلیسِ وقت حاکمِ شہرِ دمشق تھا

مضطر جون پوری کے مرثیوں میں انیس، اقبال، جوش اور جمیل مظہری کے انداز وآہنگ کی جھلک کے باوجود ایک اجتہادی شان نظرآتی ہے کیوں کہ وہ اندھی تقلید کے ہم نوانہیں وہ روح عصر سے مکمل آشنا ہیں اور انہیں انسانی زندگی کے نئے افق کا علم وادراک ہے اسی لئے وہ واقعۂ کربلا کے درس آموز پہلوؤں کو مرثیہ میں پیش کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ زندگی کو سنوارا جاسکے اور انسانی شرف وکمال کی معراج تک رسائی کی راہیں کشادہ کر کے زندگی کے بلند نصب العین کو حاصل کیا جاسکے۔ مثال کے طور پر یہ بند ملاحظہ ہوں

بیجا نہیں کہ طورِ شہادت کہیں تجھے — ہے عین حق کہ حاصل فطرت کہیں تجھے
یا نقشِ پاکِ خامۂ قدرت کہیں تجھے — کہتا ہے دل کہ راز مشیت کہیں تجھے

تو مرکز عنایت رب جلیل ہے
تیرا غبار سرمۂ چشم خلیل ہے
آزادیٔ خیال کے تجھ پر ملے سبق   تیرے افق کی دین ہے ایثار کی شفق
جھکتے ہیں تیری خاک پہ افلاک کے طبق   سن کر ترے فسانے کو ہوتا ہے قلب شق
تیری عطا ہے رفعت عنوان زندگی
پلتے ہیں تیری گود میں طوفان زندگی
تیری جبیں سے عظمت حق آشکار ہے   وابستہ تجھ سے دین نبی کا وقار ہے
تو ہی بہشت علم و عمل کی بہار ہے   مداح تیرا مرسل والا تبار ہے
رفعت جو تونے پائی ہے کب وہ حرم میں ہے
جو تجھ میں ہے بہار کہاں وہ ارم میں ہے

مضطؔر جون پوری کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے مرثیئے کی طوالت کو کم کر کے نظم کی ہیئت سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے درج ذیل فہرست مراثی پرنظر کرتے ہی اس حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے کہ ایک کے علاوہ ان کا کوئی بھی مرثیہ پینسٹھ سے زیادہ بندوں پر مشتمل نہیں ہے

نوروفا مرثیہ درحال خامس آل عبا حضرت سیدالشہد اء	اے کربلا فروغ دہ امتحاں ہے تو	۸۴ بند
مرثیہ درحال جناب علی اصغر	اے کلیم طور حق دین نبی کے تاج دار	۴۹ بند
مرثیہ درحال حضرت امام حسین	شکر خدا کہ ذاکر سبط رسول ہوں	۴۶ بند
مرثیہ درحال جناب علی اکبر	اے کربلا جلالت حق کا نشاں ہے تو	۶۴ بند
مرثیہ درحال سرکار وفا حضرت ابوالفضل العباس	سرچشمہ تجلیٔ کون ومکاں ہے علم	۶۱ بند

مضطؔر جون پوری نے اس اختصار پسندی میں بھی کلاسیکی اجزائے مرثیہ کا لحاظ رکھا ہے چہرہ، سراپا، آمد، رخصت، رزم اور شہادت وغیرہ کے ذیل میں جو بند لکھے ہیں ان سے ان کی فنی مشق ومہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے مگر ان اجزائے مرثیہ کے دوش بدوش جدید مرثیہ کا بنیادی وصف فکری انداز بھی اپنی تابانیاں بکھیرتا رہتا ہے۔ اس فکری مرحلے میں مضطؔر مرثیہ کی روح رثائیت کے پہلو کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے بطور مثال ان کے مختلف مرثیوں سے رزم وشہادت کے بیان سے متعلق درج ذیل بند ملاحظہ کیجئے

سر سرکشوں کے تن پہ جو پاتی تھی ذوالفقار   تن سے زمیں پہ جلد گراتی تھی ذوالفقار

جلوے عجیب اپنے دکھاتی تھی ذوالفقار بے پاؤں چل کے فرق اڑاتی تھی ذوالفقار
پیر اٹھ گئے تھے سب کے یہ حال مصاف تھا
جس سمت سن سے چل گئی میدان صاف تھا

ایسی تھی رزم حضرت شبیر نام دار لرزاں مثال بید تھی فوج ستم شعار
دست عدو امان کے طالب تھے بار بار کہتا تھا ڈر کے یہ پسر سعد نا بکار
اکبر کا اور شاہ مدینہ کا واسطہ
اب تیغ روک لیجئے سکینہ کا واسطہ

آواز جبرئیل نے دی رکن دیں گرا حیدر پکارے ناز شہ مرسلیں گرا
زہرا نے دی صدا کہ مرا نازنیں گرا بولے رسول پاک تاج کتاب مبیں گرا
جسم حسین تیروں کی نوکوں پہ رک گیا
سر شاہِ دیں کا سجدۂ خالق میں جھک گیا

تھا تشنگی سے خشک گلوئے شہ امم شمرِ لعیں جو لے بڑھا خنجر ستم
لرزی زمین حشر کے ساماں ہوئے بہم پشتِ امام پاک پہ رکھا نجس قدم
صدمہ ہوا کمال شہِ مشرقین کو
دیکھا لعیں نے جھک کے گلوئے حسین کو

مضطرؔ جون پوری قدیم روایات مرثیہ گوئی کوترک کئے بغیر مرثیئے میں جدید خیالات اور موضوعات کوشامل کرنے کے حامی ہیں جس کی بناء پران کے مرثیوں میں قدیم وجدید رنگ کا خوبصورت امتزاج موجود ہے

حقیقت حال یہ ہے کہ ان کے یہاں کلاسیکی مرثیئے کے اجزاءتمہید،چہرہ،رجز،رہوار کی تعریف،ساقی نامہ اور بہار یہ مضامین بہ آسانی مل جائیں گے وہ کلاسیک کی طرح واقعہ نگاری سے بھی اپنے مرثیوں کومزیّن کرتے ہیں مگر واقعہ کی تفصیلات کے بجائے تأثرات پیش کرتے ہیں ان تمام چیزوں کی موجودگی کے باوصف جو شئے انہیں قدماء سے ممتاز ومنفرد کرتی ہے وہ ان کی زبان فکری انداز،تسلسل وربط اور عصری موضوعات کی مصوری ہے

☆☆☆☆☆

صاحبزادہ شوکت علی خان: ٹونک کی علمی وروحانی روایت کے گل سرسبد

شریف حسین قاسمی

اب تو کوئی چالیس برس ہونے کو آئے کہ صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب سے راہ ورسم کے دروازے کھلے تھے۔ راقم اپنے اساتذہ کے ہمراہ اور تنہا بھی ہر سال ہی ٹونک آتا رہا اور شوکت صاحب کے علمی تبحر سے مستفیض ہوتا رہا۔ شوکت صاحب بھی دہلی آتے رہتے تھے، کبھی دفتری کام سے اور کبھی علمی مجالس میں شرکت کی غرض سے۔ دہلی میں بھی آپ سے ملنے اور علمی استفادہ کا موقع ملتا رہا۔ آپ سے ہر ملاقات آپ کے شخصی محاسن اور علمی وفکری فتوحات کو جاں گزیں کرتی رہی۔ اس حقیر فقیر پر آپ کی نوازشات بے شمار رہی ہیں، ان نوازشات سے میری مراد وہ شفقتیں اور توجہات ہیں جو آپ نے میرے علمی کاموں میں مجھ پر برسائی ہیں اور وہ آج بھی جاری ہیں۔

راقم نے نذر باغ میں یہ عربک و پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دیکھا ہے۔ اور ابھی تو ٹونک میں بڑی تعداد ایسے حضرات کی موجود ہے، جس نے اس علمی مرکز کے ابتدائی دور کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور پھر اس کی نشو ونما اور ترقی کے ادوار بھی دیکھے ہیں۔ شوکت صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ فہم دی ہے کہ وہ اجتماعیت کی بنیادی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں۔ جماعتی کاموں اللہ کا ہاتھ مددگار رہتا ہے، یہ گر شوکت صاحب نے اپنی روایات سے خوب سیکھ لیا تھا۔ انہوں نے ٹونک میں چند ایسے جواہرات تلاش کر لئے تھے جنہوں نے اپنے علمی وعملی تعاون سے شوکت صاحب کے ہاتھ مضبوط کئے۔ آپ کے شانہ بہ شانہ اس علمی مرکز کی ترقی کے لئے رات دن ایک کر دیئے۔ شوکت صاحب کی راھنمائی، ان معاونین کا بےلوث تعاون، شوکت صاحب کے بزرگوں کی دعائیں اور اھل ٹونک کی تمنائیں رنگ لائیں اور یہ علمی مرکز رسمی طور پر وجود میں آ گیا جسے ہم آج مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں، اور جس کے علمی وتہذیبی کارناموں کا علمی برادری میں کھلے دل سے اعتراف کیا جاتا ہے، نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی۔

اس انسٹی ٹیوٹ کے بانی مبانی شوکت صاحب کی شخصیت نہایت تہہ دار ہے۔ یہ اپنی علمی تربیت کے لحاظ سے مورخ، اپنے میلانِ طبع کی وجہ سے فارسی، عربی اور اردو ادبیات کے گراں مایہ محقق اور صاحب طرز ادیب، صاحبان علم وفضل کے سرپرست اور ان کے صمیمی دوست، علمی وتحقیقی کام خود کرنے اور دوسروں کو یہ کام انجام دینے کے لئے اکسانے، جوش وولولہ سے کام لینے اور ان کی حتی المقدور مدد وراہنمائی کرنے، چھوٹوں کو علمی کام کرنے کی راہیں دکھانے، ان کو موضوعات تجویز کرنے، تحقیق وتدوین کے طریقوں اور معیاروں سے ان کا تعارف کرانے اور پھر جو اس قسم کی علمی وادبی اور تحقیقی کاوشوں کو کامیابی سے سرانجام دیں، ان کو حد سے زیادہ

سراہنے،اوران سے مزید کام لینے کے لئے کبھی ان کا دامن نہ چھوڑ نا یہ وہ امتیازات ہیں جن کے شوکت صاحب حامل ہیں اور جن کا میں خود چشم دید گواہ رہا ہوں۔

صاحبزادہ شوکت صاحب کو اس ناچیز نے بارہا سیمیناروں اور کانفرنسوں میں خطاب کرتے سنا ہے، وہ مورخین کی کانفرنس ہو یا فارسی عربی اساتذہ وغیرہ کے سیمینار ہوں۔آپ نے اپنا خطاب شروع کیا اور حاضرین ہمہ تن گوش ہوئے۔ جہاں آپ کا تحقیقی انداز حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا، وہیں آپ کا طرز بیان سب کو مبہوت کر دیتا تھا۔ مجھے وہ سیمینار یاد ہے جو خواجہ ہال بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں خود محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں منعقد ہوا تھا۔ متعدد اسکالرز جمع تھے۔اس کی صدارت جناب سید حامد صاحب فرمارہے تھے۔ان سے ہم سب واقف ہیں۔ یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے تھے۔ تعلیم سے خاص تعلق خاطر تھا۔ بڑے صاحب طرز لکھنے والے تھے۔شوکت صاحب نے اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا۔خواجہ صاحب پر گفتگو کررہے تھے۔شوکت صاحب کی روحانی تربیت اور آپ کا صوفیائے کرام سے جو قلبی تعلق ہے، وہ آپ کی گفتگو میں جوش ماررہا تھا۔ ہر شخص کان لگا کر سن رہا تھا اور بعض صاحب دل اپنے آنسو روک نہیں پارہے تھے۔شوکت صاحب کا مرصع و مسجع طرز بیان اپنی تمام تر خوبیوں کے کے ساتھ گفتگو میں درآیا تھا۔خود سید حامد بھی اسی قسم کی گفتگو کرتے تھے،اور اسی طرز تحریر کے لئے پہچانے جاتے تھے۔شوکت صاحب نے اپنی تقریر ختم کی۔اب باری آئی سید حامد صاحب کی ،انھیں سب سے آخر میں صدارتی تقریر کرنی تھی، وہ اٹھے مائک پر آئے اور فرمایا' میں ایک مضمون لکھ کر لایا تھا۔ وہ نہیں پڑھوں گا۔اس لئے نہیں پڑھوں گا کہ شوکت صاحب نے جس مرصع طرز بیان میں ابھی اپنا مقالہ پیش کیا ہے،اس کے سامنے میری تحریر پھیکی پڑ جائے گی'

اس طرح ایک صاحب طرز ادیب نے ایک دوسرے صاحب طرز ادیب کی فوقیت کو خراج عقیدت وتحسین پیش کیا۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کی موجودگی میں جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے دل کانپتا ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ،کلیجہ منہ کو آتا ہے، انہوں نے ایک بار صاحبزادہ شوکت صاحب کا مولانا ابوالکلام آزاد پر مضمون سن کر حسرت سے کہا تھا' شوکت صاحب اگر اس نوعیت کا ایک مضمون میرے بارے میں لکھ دیں، تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں' اس سے زایادہ ایک صاحب ذوق ونظر شوکت صاحب کی طرز تحریر کو کیا خراج تقدیر وتحسین پیش کرسکتا ہے۔

راقم فارسی کا ایک ادنیٰ طالب علم ہے۔شوکت صاحب نے از راہ لطف میری مرتبہ ایک کتاب اپنے ادارہ سے شائع کرنے کی اجازت دی۔ وہ کتاب ذکر جمیع اولیائے دہلی ہے۔ کتاب فارسی میں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب اس ادارہ سے دوبارہ شائع ہوئی۔ میں نے اس پر ایک مفصل تحقیقی پیش لفظ لکھا۔شوکت صاحب نے اسی کی روشنی میں اس پر ایک تحریر وہ بھی مفصل مرقوم کی اور مجھے محسوس ہوا کہ صاحبزادہ صاھب نے میرے بیان کردہ حقائق کو زیادہ واضح طور پر دہرایا ہے اور اس طرح جو کمیاں میرے پیش لفظ

میں پائی جاتی تھیں انہیں دور کیا ہے۔

ایک کتاب خانے کا تعارف اس کی توضیحی فہرست ہی سے کرایا جا سکتا ہے۔ شوکت صاحب اس حقیقت سے واقف ہیں۔ آپ نے عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے فوراً بعد ہی اس اہم کام کی طرف توجہ کی اور عربی اور فارسی مخطوطات کی کئی جلدوں میں فہرستیں شائع کیں۔ عربی مخطوطات کی جدا اور فارسی مخطوطات کی الگ، جن حضرات نے یہ فہرستیں توجہ اور دلچسپی سے پڑھی ہیں وہ اس حقیقت کا اقرار کریں گے کہ یہ فہرستیں معیاری ہیں اور اس ادارے میں محفوظ مخطوطات کا ایسا تعارف ہیں کہ اس سے بہتر شاید مشکل ہے۔ اس کام میں شوکت صاحب کے معاون خاص مولانا عمران صاحب رہے ہیں جو خود ایک بلند پایہ عالم اور محقق تھے۔ صرف یہی نہیں، شوکت صاحب نے اپنے متعدد مقالات میں اس ادارے کے اہم اور منحصر بہ فرد مخطوطات کا زیادہ تفصیل سے تعارف بھی کرایا ہے جو خود ایک نہایت علمی اور تحقیقی کام ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ اس حقیقت کا اعتراف کروں کہ شوکت صاحب کے بیشتر علمی و تحقیقی کام کا محور یہی انسٹی ٹیوٹ رہا ہے، وہ اس کے بانی ڈائرکٹر رہے ہیں اور اس کا حق ادا کرنے کے لئے انہوں نے جو بنیادی کام انجام دیئے ہیں ان کی وجہ سے اس ادارے کا پوری علمی دنیا میں تعارف ہوا ہے اور اس کی اہمیت اور علمی و تحقیقی مناسبت کا لوہا مانا گیا ہے۔ ظاہر ہے شوکت صاحب کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی کاموں کا پانچ سات صفحات میں تعارف کرانا بعید از امکان ہے۔ اس لئے میں بہرحال اس ضمن میں بعض مزید اشارے کرنا چاہوں گا

ابھی میں نے شوکت صاحب کی زبان کے بارے میں عرض کیا ہے، اس سلسلے میں عرض کروں گا کہ آپ نے اپنے مافی الضمیر کو کسی خاص موضوع کے اظہار کے لئے بعض خاص تراکیب سے کام لیا ہے۔ یہ تراکیب کہیں سے یا کسی سے مستعار نہیں لی گئی ہیں، بلکہ خود شوکت صاحب کے خلاقانہ ذہن کی پیداوار ہیں اور موضوع پر آپ کی گرفت کی غماز بھی ہیں۔

حافظ محمود شیرانی سے خاص طور پر اس ٹونک میں کون واقف نہ ہوگا۔ یہاں کا یہ فرزند یگانہ فارسی اور اردو زبان و ادب کے افق پر سورج و چاند کی طرح چمکا اور اپنی گراں قدر تصانیف سے ان دونوں زبانوں کے ادب عالیہ کی دنیا کو جگمگا گیا۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہوں گا کہ وقت اجازت نہیں دیتا، لیکن شوکت صاحب نے آپ کی علمی و تحقیقی کارگزاریوں کی نشان دہی کرنے کے لئے بہت سی تراکیب استعمال کی ہیں۔ ان میں دو یہ ہیں، قدامت شناس اور نقاد سلفیات۔ ان دونوں تراکیب کی روشنی میں جناب حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی جستجو کے دو پہلو پر تفصیل سے گفتگو کی جا سکتی ہے اور شوکت صاحب کی یہ دو تراکیب شیرانی صاحب کی مفصل علمی و تحقیقی کارگزاریوں کو کوزے میں بند کر دیتی ہیں۔

اب بات چوں کہ حافظ محمود شیرانی تک پہنچ گئی تو لگے ہاتھوں حضرت علامہ شبلی کی شعر العجم اور شیرانی صاحب کی اس پر تنقید شعر العجم کا بھی شوکت صاحب کے شیرانی صاحب پر مضمون کی روشنی میں گفتگو ہو جائے۔ ہندوستان میں ان دونوں نہایت

اہم کتابوں کو لے کر، اہل علم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک علامہ کا حامی ہے اور دوسرا شیرانی صاحب کا طرف دار، شوکت صاحب اسی شہر کے باسی ہیں جس سے شیرانی صاحب کا تعلق تھا، لیکن اس وطنی مناسبت کو نظر انداز کرتے ہوئے شوکت صاحب نے ان دونوں کتابوں پر جو اپنی رائے دی ہے، وہ ان کے نہایت علمی رویئے کی مظہر اور ہر قسم کے تعصب سے مبرا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے جس طرح شعر العجم شبلی کی مایۂ ناز تخلیق ہے اسی طرح علامہ شیرانی کی مایۂ ناز تخلیق تنقید شعر العجم ہے۔ ایک تخلیق ہے دوسری تنقید۔ ایک آغاز ہے دوسرا اضافہ، ایک تدوین ہے دوسری تعمیر، ایک خواب پریشان ہے تو دوسری اس کی تعبیر حسین اور دونوں کو ہر حیثیت سے ربط خاص بھی ہے اور اختلاف نظر بھی۔۔۔

شیرانی صاحب پر شوکت صاحب کی تحریریں اس وجہ سے بھی نہایت اہمیت کی حامل ہیں کہ ان میں بعض ایسی اطلاعات مرقوم ہیں جو شوکت صاحب کو ان بزرگ اہل ٹونک سے دریافت ہوئی ہیں، جنہوں نے شیرانی صاحب کو دیکھا تھا، ان سے ملاقاتیں کی تھیں، ان سے علمی و ادبی مذاکرے کئے تھے۔ اس نوعیت کی اطلاعات، دوسری جگہ نظر نہیں آتیں اور یہ شیرانی صاحب کی ذاتی زندگی اور علمی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

میں اس سے زیادہ آپ کا وقت لینا نہیں چاہتا۔ اپنے معروضات کو شوکت صاحب کے اس اقتباس پر ختم کرتا ہوں جو راقم نے آپ کے مضمون محمود شیرانی کا ایک نایاب مبیضہ 'تاریخ ادب فارسی کی تمہید سے اخذ کیا ہے۔ اس میں ماخذ اور مراجع کی اہمیت ،اس سلسلے میں مخطوطات کی مناسبت، ان کے مطالعے سے اخذ نتائج وغیرہ پر ایک محققانہ اور مؤرخانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ شوکت صاحب فرماتے ہیں اور اپنی تحقیقی و علمی جستجو کے نتائج کا نچوڑ پیش کرتے ہیں'

ماخذ و مصادر، منابع و مراجع، اعلام و آثار، اخبار، اسانید و مقالید جہاں تاریخ کا مہتم بالشان سرمایہ ہیں وہاں تحقیق و تدوین ،ترتیب متون کے لئے بھی اہم اور بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ تحقیق میں استدراک واستخراج سے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور استنباط وارتباط سے تاریخی کردار بنتے ہیں اور تصدیق و تدقیق سے شواہد حقائق کے دفتر کے دفتر کھلتے چلے جاتے ہیں جن سے ایسے بہت سے تاریخی واقعات و واردات جو ثقافت وشہادت کی روشنی کے بغیر ہی مقبول خواص وعوام ہو گئے ہوں، کی پردہ دری ہوتی ہے اور بہت سے ایسے حقائق جو عدم استخراج واستدراک کے باعث معرض گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں منظر شہود پر آجاتے ہیں انہیں منابع و مراجع سے تاریخ بنتی بھی ہے اور بگڑتی بھی ہے یہ آثار واعلام اگر نہ ہوں یا دستیاب اندرونی شہادتوں کے مقابلے میں صرف خارجی شواہد پر اعتماد کر لیا جائے تو اصل تاریخ پردۂ خفا میں گم ہو جاتی ہے۔ اس لئے متون کا مطالعہ اور وہ بھی داخلی اور خارجی شواہد حقائق کی روشنی میں ہو تو حقیقت سامنے آتی ہے اور تاریخ ان شہادتوں کی بنیاد پر بین السطور میں بھی پڑھی جاتی ہے

تذکرہ شعرائے جے پور مولانا احترام الدین احمد شاغل عثمانی

ڈاکٹر رئیس احمد شعبۂ اردو موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی

اودے پور(راجستھان)

تذکرہ شعرائے جے پور کے مصنف مولانا احترام الدین احمد شاغل عثمانی ایک ہمہ گیرشخصیت کے مالک تھے۔صوبۂ راجستھان کے وہ پہلے شخص ہیں جن کو راجستھان میں بابائے اردو کے نام سے موسوم کیا گیا۔مولانا ایک کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین ادیب بھی تھے۔علاوہ ازیں وہ محکمۂ پولیس کے اعلیٰ افسر، انجمن ترقی اردو راجستھان کے سکریٹری (تا دم حیات) اور ایک مقرر،خوش نویس اورتذکرہ نگار کی حیثیت سے بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔

مولان پینشن کے بعد ہمہ وقت علمی وادبی مشاغل میں مصروف ومشغول رہے۔مولانا منظورالحسن برکاتی نے بھی دیوان شاغل جلداول کے تعارف میں موصوف کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب بھی شاغل صاحب سے ملا ان کو عبادت یا علمی وادبی مشاغل میں مصروف پایا(۱)

مولانا نے ان حالات میں جب اردو پر تاریکی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور راجستھان میں یہ زبان بقا وفنا کی کشمکش میں مبتلا تھی اس کی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور اپنی پوری زندگی اسی کے لئے وقف کردی۔آپ نے ۱۹۵۰ء میں جے پور میں جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کا مرکز قائم کرایا اورصوبۂ راجستھان میں ان امتحانات کی جانب عوام کی توجہ مبذول کرائی اسی طرح ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی جے پور میں ایک شاخ قایم کی جس نے اردو زبان وادب کی نمایاں خدمات انجام دیں۔۱۹۵٦ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی صوبائی انجمن بنائی گئی جس کے جنرل سکریٹری مولانا ہی مقرر ہوئے ،اور آپ یہ خدمت آخر وقت تک انجام دیتے رہے۔انجمن مذکور نے راجستھان میں اردو کی بقا وتحفظ اس کے شعروسخن کے فروغ اور تعلیم وتدریس کے لئے جو قابل لحاظ خدمات انجام دیں وہ تاریخ ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔اس انجمن کے زیراہتمام متعدد مشاعرے،سیمینار،سمپوزیم،کانفرنس اور کنوینشن بھی منعقد کئے گئے ان میں سے بعض کی رودادیں بھی شائع کی گئیں جن کی اس اعتبار سے ادبی اہمیت ہے کہ ان میں شعراء وادبا کے حالات ان کا کلام اور مقالات بھی شامل ہیں۔

مولانا نے ادب ،تاریخ،تذکرہ ،تصوف ،فقہ اور قانون جیسے اہم موضوعات پر متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں ۴۵ زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ان کی تفصیل یہاں بے محل ہے۔مولانا کی شاعری اور ان کی نثر نگاری کے جائزے کے لئے بھی الگ سے ایک مبسوط مضمون کی ضرورت ہے۔مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ موصوف ایک صاحب طرز نثر نگار اور بلند پایہ شاعر تھے۔

اس ضمن میں پروفیسر آل احمد سرور کی رائے پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے

شاغل نے برسوں کی محنت سے زبان اور فن کے نکات پر عبور حاصل کیا ہے ان کی شاعری میں صحت بیان اور ان کی نثر میں جان ہے(۲)

علاوہ ازیں مولانا ایک کامیاب تذکرہ نگار بھی تھے' تذکرہ شعرائے جے پور' ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔فن تذکرہ نگاری کے پیش نظر ان سطور میں مذکورہ تذکرے کے تنقیدی جائزے کی ایک مبتدیانہ کوشش کی گئی ہے جس پر تبصرے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

تذکرہ شعرائے جے پور پہلی بار ۸ فروری ۱۹۵۸ء کو زیور طباعت سے آراستہ ہوا اس لئے اس کا سال تصنیف ۱۹۵۸ء قرار دیا گیا، حالانکہ یہ سن تصنیف نہیں ہے بلکہ سن طباعت ہے۔بقول تذکرہ نگار اس کی ابتداء ۵/اپریل ۱۹۵۰ء کو ہوئی تھی چار سال اور نو مہینے کی مسلسل جانفشانی کے بعد اس کی تکمیل ہوئی (۶ جنوری ۱۹۵۵ء) لیکن یہ منزل منزل مقصود نہیں کہی جا سکتی کیونکہ ابھی کئی مراحل باقی تھے۔ترتیب تذکرہ کے فوراً بعد اس کا تمہیدی حصہ مرتب کیا گیا جسے حصہ اول کہا جا سکتا ہے۔سال تصنیف کے تعین میں انتساب کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا جو ذیل میں درج ہے

میں اپنی اس ادبی خدمت کو باچشم اشکبار اپنے فرزند ابوالکرم اکرام الدین عثمانی منشی فاضل کے نام معنون کرتا ہوں جس کو انتہائی ادبی شوق اور شعر و سخن کا بغایت ذوق تھا جو بعمر ۲۵ سال ۱۹۴۷ء کے خونی انقلاب میں ۲۱ ستمبر ۱۹۴۷ کوٹرین میں شہید ہوا

انا للہ و انا الیہ راجعون

غم نصیب شاغل

۱۹۵۵/۹/۲۱

اس انتساب کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ستمبر ۱۹۵۵ میں مکمل ہوا۔حضرت قمر واحدی کا حسب ذیل قطعہ تاریخ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی طباعت میں تقریباً دو سال لگے۔لیکن یہ قطعہ بھی صحیح سنہ تصنیف پر مبنی نہیں ہے۔

جناب احترام الدین احمد مرتب کرد چوں ایں جام شاغل
ہمہ عالم جزاک اللہ می گفت برایں کوشش برایں اقدام شاغل
بخواہد ماند زندہ نام اسلاف

ز سعی فرخ و فرجام شاغل	ز لطف خاص و فیض عام شاغل
ہمہ رنداں و مئے آشام شاغل	کہ شہکار است ایں ارقام شاغل
قمر ایں نقش گر صورت نہ بستے	بماند تا ابد کہ نام شاغل

۱۹۵۷ء

دراصل تذکرۂ ہذا بار اول ۸؍فروری ۱۹۵۸ء کو یونین پرنٹنگ پریس دہلی سے زیورطباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا اور قطعی طور پر یہی اس کا سنہ اشاعت قرار پاتا ہے۔ سن تصنیف کسی ایک سال کو قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ اس کی ترتیب ۶؍جنوری ۱۹۵۵ء کو عمل میں آچکی تھی اور اس کا آغاز ۱۵؍اپریل ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا۔ اس تناظر میں یہ درمیانی مدت یعنی چار سال نو ماہ اس کا تصنیفی دور کہا جاسکتا ہے لیکن انتساب، قطعۂ تاریخ، طباعت تذکرہ و سنہ طباعت بار اول کا دائرہ ۸؍فروری ۱۹۵۸ء تک محیط ہے ظاہر ہے کہ اس مدت میں بھی مولانا تذکرہ ہذا کو حتی الامکان معیار نقد پر پورا اتارنے کے لئے نوک پلک سنوارنے میں مشغول رہے ہوں گے۔ تذکرے میں شعراء کی تصاویر بھی پیش کی گئی ہیں اور جو تصاویر بعد میں موصول ہو سکیں ان کو ضمیمے کی شکل میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طباعت کے مراحل سے گزرنے میں خاصا وقت صرف ہوا ہوگا جس کا ذکر تذکرۂ ہذا کے تعارف میں بھی کیا گیا ہے لیکن تذکرے کی تصنیف و ترتیب کے ضمن میں یہ ایک مثبت عمل تھا جس نے ممکنہ طور پر تذکرے کو پختگی بخشی۔ بقول تذکرہ نگار:

میں نے حتی الامکان حالات کے فراہم کرنے اور انتخاب کلام میں صحت و محاسن کا خیال رکھا ہے تنقید میں احتیاط برتی ہے اور اختصار سے کام لیا ہے تنقیص سے اعراض کیا ہے اور کسی شاعر کی کمزوریاں اجاگر کرنے کے درپئے نہیں ہوا (۳)

تاخیر طباعت کا احساس سرور صاحب کو بھی تھا مگر اس کا انہوں نے جواز پیش کیا:

تذکرے کی اشاعت میں مختلف وجوہ سے خاصی تاخیر ہوگئی لیکن ادبی کارنامے غیر فانی اور قید زمان و مکان سے آزاد ہوتے ہیں (۴)

اس طرح تذکرے کا تصنیفی سفر اس کی ترتیب کے آغاز سے تکمیل تک یعنی ۵؍اپریل ۱۹۵۰ء سے ۸؍فروری ۱۹۵۸ء پر محیط ہے جو سات سال اور دس ماہ کی محنت کا ثمرہ ہے

راجستھان کے شعرائے اردو کے تذکروں میں زیر بحث تذکرے کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ تذکرہ قدیم تذکروں کی طرح حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہوا ہے۔ اس انداز ترتیب کی خوبی یہ ہے کہ کسی مخصوص شاعر کے حالات جاننے کی ضرورت ہو تو محض ورق گردانی سے کام چل جاتا ہے لیکن زمانی اعتبار سے علاقے کے ادبی ارتقاء کا جائزہ لینا ہو تو بڑی دشواری پیش آتی ہے اور تاریخی ترتیب قائم کئے بغیر کچھ اندازہ نہیں ہوسکتا۔

بعض قدیم تذکروں میں زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھ کر شعراء کو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس نوعیت کے تذکرے ادبی تاریخ کی حیثیت بھی حاصل کر لیتے ہیں 'نکات الشعراء' سے 'گلشن بے خار' تک ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں تاریخی و زمانی ترتیب کو ترجیح دی گئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ 'آب حیات' اس قسم کی تذکرہ نگاری کی نکھری ستھری شکل ہے اور صاحب تذکرہ کے تاریخی و تنقیدی شعور کو ظاہر کرتی ہے۔ فن تذکرہ نگاری کے مدنظر تذکرہ نگار کے لئے تاریخی ترتیب یا ادوار کی تقسیم چنداں ضروری نہیں شعراء کی فہرست کی تکمیل اور کوائف کی صحت کا خیال رکھا جائے تو تذکرہ مکمل سمجھا جاتا ہے۔ شاید مولانا شاغل تذکروں کی ترتیب کے طریقۂ کار سے باخبر تھے چنانچہ انہوں نے اس تذکرے میں تذکرہ نگاری کی روایت کو تو ملحوظ رکھا ہی ساتھ ہی ساتھ یہ جدت بھی پیدا کر دی کہ اصل تذکرہ کے آغاز سے قبل 'ادب جے پور کا ماضی و حال' بطور تمہید شامل کر دیا جو اس علاقے کے ادبی کارناموں کا ایک اجمالی جائزہ ہے۔

یہ تذکرہ ۵۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کل ۲۲۵ شاعروں کا ذکر ہے۔ ابتدائی ۵۲ صفحات تمہیدی نوعیت کے ہیں اصل تذکرہ ۵۳ صفحہ سے شروع ہوتا ہے اس اعتبار سے یہ حصہ ۴۷۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

راجستھان میں اردو ادب کی تاریخ کے نقوش اس وقت تک نمایاں نہیں ہو سکتے جب تک تذکرہ ہٰذا کے حصہ اول کا بہ نظر غائر مطالعہ نہ کیا جائے۔ مولانا نے اس مختصر خاکے میں جے پور کے ادب کا تاریخی شواہد کو مدنظر رکھتے ہوئے جائزہ لیا ہے۔ یہ خاکہ تاریخی و تحقیقی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور محققین و مؤرخین کے لئے مشعل راہ ثابت ہوتا ہے نیز تحقیقی و تنقیدی شعور کی تربیت کرتا ہے۔ مولانا نے اس مقدمے میں حقائق و شواہد اور تاریخ و سنین کا خاص طور سے خیال رکھا ہے جو ان کے تاریخی و تحقیقی شعور کی پختگی کو ثابت کرتا ہے

تمہیدی حصے میں قائم کردہ ذیلی عنوانات کے مطالعے سے بیان میں پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا، مثلاً معاصر شعراء کی چشمک، اساتذہ کی جانشینی، مشاعروں مناعتوں، مسالموں اور جے پور کے ادبی اخبارات و رسائل، ادبی انجمنوں اور اداروں کا ذکر بڑے ایجاز و اختصار سے کیا ہے۔ مقدمے کے اہم ذیلی عنوانات اس طرح ہیں 'بانی جے پور۔ مہاراجہ سوائی مان سنگھ' 'جے پور کالج' 'غدر ۱۸۵۷ء' 'سوسائٹی کا قیام اور اخبار و مطبع کا اجراء' 'مشاعرے' 'اساتذہ کی جانشینی' 'شعراء میں افتراق' 'جے پور میں پہلا آل انڈیا مشاعرہ' 'متفرق مشاعرے' 'دوسرا آل انڈیا مشاعرہ' 'مشاعرہ سلور جبلی' 'زمانۂ حال کے مشاعرے' 'جے پور کی ادبی انجمنیں' 'جے پور کے علمی و ادبی اخبارات و رسائل' 'ماہنامہ روشنی' اور 'جے پور کے مطبعے' وغیرہ

مذکورہ عنوانات سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن کے تناظر اور مطالعے سے مولانا کے تاریخی شعور کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جے پور کالج کا قیام۔۔۱۸۴۵ء(۵) میں جے پور کالج کا اجراء ہوااور عربی، فارسی،سنسکرت، ہندی، اردواور انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا کالج کی ترقی کا زمانہ ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا جب بنگالی مدرسین اس میں مامور کئے گئے ،اوراس کے پرنسپلوں کو وزارتیں ملنا شروع ہوئیں،اس کالج کی ایک مختصر سی تاریخ سید حیدر حسن ذکی و یکتا نے ۱۸۹۳ء میں اس کے پرنسپل بابو ہری داس کا مرثیہ لکھتے ہوئے نظم میں بیان کی ہے،جس کا پہلا شعر یہ ہے:

دوش دیدم عقل را مسند نشیں دو سرائے زر نگار مدرسہ

سوسائٹی کا قیام اوراخبار ومطبع کا اجراء۔۔۲۶/ مارچ ۱۸۶۹ء کو جے پور میں ترقی علوم وفنون کی غرض سے ایک سوسائٹی بھی قائم ہوئی جس کی سرپرستی مہاراجہ نے کی اور مالی امداد دینا بھی منظور کیا۔اس کے افتتاحی جلسے میں مہاراجہ اور عمائدین وعلمائے ریاست سے علاوہ ایجنٹ، گورنر جنرل اور پولٹیکل ایجنٹ وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ یہ جلسہ میڈیکل ہال میں منعقد ہوا تھا۔ جلسے میں قرار پایا کہ ۱۵ دن میں ایک بار اس کا اجلاس ہوا کرے،،جس میں علمی وادبی تقاریر وغیرہ کی جائیں نیز ایک اخبار اور ایک مطبع بھی جاری کیا جائے۔ چنانچہ حکیم سلیم خاں خستہؔ نے'خاورنور'نامی مطبع قائم کیااور'نیرراجستھان' نامی اخبار نکالا۔مطبع کی تاریخ مولان تسلیم نے کہی اس قطعے کا آخری شعر یہ ہے:

ہے سر بیم نامش تسلیم یافتم 'خاور نور' جے پور

یقیناًراج پوتانہ ایجنسی میں یہ پہلا اخبار اور پریس تھا جو جے پور میں جاری ہوا

مشاعرے۔۔۔حکیم سلیم خاں خستہؔ کے یہاں مشاعرے ہونا مسلم ہے جن کا کچھ انتخاب نیرراجستھان نامی اخبار میں طبع ہوتا تھا اور مختلف اصحاب کی پوری پوری غزلیں چھپتی تھیں ،تنقید وتبصرہ بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک بار حکیم سلیم خاں خستہؔ کے یہاں طرحی مشاعرہ تھا۔موجودالوقت شعراء میں سے تقریباً سبھی شریک تھے۔مرزا مائلؔ نے اپنی غزل شروع کی جب یہ شعر پڑھا:

ٹوٹے خدا کا قہر فرشتوں کی جان پر جنت کو لے چلے ہیں مجھے کوئے یار سے

تو میر واجد حسین شگفتہؔ شاگرد رشک لکھنوی نے اعتراض کیا کہ۔ جان پر قہر ٹوٹنا عورتوں کا محاورہ ہے مرزا صاحب کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ حکیم خستہ نے طراق سے جواب دیا کہ۔آپ کوئی مردانہ محاورہ اس کی جگہ باندھ کر دکھایئے تو اعتراض صحیح ہوسکتا ہے۔

ادبی صحبتوں کا اثر تھا کہ سرکاری کاروبار میں بھی شعروسخن کا دخل ہونے لگا تھا اور ایسے لوگ بھی مصرعہ یا شعر موزوں و چست کر دیتے تھے جو شاعر نہ تھے۔مثلاً میر عبداللہ سررشتہ دار فوجداری نے ایک مثل پر حکم لکھا:

ناظر کرے رپورٹ کہ کہ آسامی کیا ہوئی

منشی ذکاءالدین ناظر نے یہ رپورٹ کی

آئی تو تھی و لے یہ ضمانت رہا ہوئی

کسی تعلقہ دار ملازم صیغۂ مال کو پنڈت موتی لال اٹل دیوان ریاست جے پور نے کسی وجہ سے برخاست کر دیا، آخر منشی رام جی داس میر منشی ریاست کی خدمت میں حاضر ہوا اور امداد کی درخواست کی۔ انھوں نے کہا کہ جب پنڈت جی اجلاس میں آئیں تو بطور درخواست یہ شعر لکھ کر ان کو دے دینا:

ماہ سے ماہی تلک بخشش کی تیری دھوم ہے پر نہیں معلوم بندہ کس لئے محروم ہے

اس نے ایسا ہی کیا اس شعر کی پشت پر پنڈت جی لکھا

بس نہیں چلتا ہے بھائی ہر جگہ مقسوم ہے

جے پور میں پہلا آل انڈیا مشاعرہ۔۔ جے پور کی ادبی دنیا میں ۲۰ تا ۲۲/اپریل ۱۹۳۵ء تاریخ یادگار رہے گی کہ پہلی بار یہاں آل انڈیا مشاعرہ 'رام نواس' جیسے شاداب چمن زار واقع 'البرٹ ہال' میں ہوا جس میں مقامی و بیرونی ۷۰ اشعراء نے ۳۶ گھنٹے کی چار نشستوں میں اپنے فیض کلام سے تازہ روح شعر و سخن پھونک دی اور خوابیدہ جذبات ادب کو بیدار کر دیا۔ مصرع طرح تھا

آئے نہ بے نقاب وہ میرے خیال میں

جے پور کی ادبی انجمنیں۔۔ جے پور میں ادبی انجمنیں بھی کافی قائم ہوئیں اور انھوں نے کچھ نہ کچھ کام بھی کئے۔ پہلی انجمن ۲۶/مارچ ۱۸۶۹ء کو زیر سرپرستی مہاراجہ سوائی رام سنگھ قائم ہوئی، دوسری بزم ادب ۱۸۷۲ء میں زیر صدارت مولانا تسلیم، تیسری بزم احباب اغلباً ۱۸۹۰ء میں قائم ہوئی جس کے سکریٹری مولانا سراج الدین احمد کنتوری تھے۔ ۱۹۳۴ء میں بزل ادب کی ایک جدا شاخ ہوگئی جو مولانا اطہر ہاپوڑی کی صدارت میں قائم ہوئی تھی اردو سیاست کی لپیٹ میں ایسی آئی کہ جان بچانا دشوار ہوگیا۔ یہ سرسیمگی کئی سال قائم رہی۔ کچھ اصحاب کو اس کا احساس ہوا اور انھوں نے ۲۶/مارچ ۱۹۵۳ء کو انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) کی شاخ جے پور میں قائم کر کے زبان و ادب کی خدمت کا تہیہ کیا۔

جے پور کے علمی و ادبی اخبار و رسائل۔۔ جے پور میں پہلا ہفت روزہ اخبار ۱۸۶۹ء میں نیر راجستھان نکلا، جس کی ادارت حکیم سلیم خاں خستہ کے ذمہ تھی اغلباً ۱۸۸۷ء میں ماہنامہ البیان میرے والد مرحوم کی ادارت میں جاری ہوا۔ ماہنامہ قوم ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر مولوی اساس الدین احمد تسنیم تھے۔ یہ ۱۹۱۹ء تک چلتا رہا، اگرچہ درمیان میں کئی بار بند ہوا اور پھر جاری کیا گیا، مضامین معیاری ہوتے تھے۔ ماہنامہ الکمال اس کا پہلا نمبر جون ۱۹۰۶ء میں نکلا۔ حکیم سید واحد علی خاں مسیح اور منشی عبدالحمید اخگر اس کے ایڈیٹر تھے۔ اغلباً تین سے زیادہ نمبر اس کے نہ نکلے تھے کہ بند ہوگیا۔ ماہنامہ جوہر سخن یکم جنوری ۱۹۱۴ء کو جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر مولوی سید نظیر حسن سحاب تھے۔ یہ رسالہ بزم ادب کا پرچہ تھا مگر سال بھر کے پہلے ہی بند ہوگیا۔

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تذکرے کے اس حصے میں جے پور کے شعروادب کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ مرتب ہوگئی ہے۔ایک تذکرہ نگار کے لئے جو اوصاف درکار ہوتے ہیں مولانا کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنے عہد کی سرگرمیوں کے علاوہ زمانۂ قدیم کی مختلف انجمنوں اور اداروں کا بیان بہ تفصیل پیش کیا ہے۔بقول پروفیسر آل احمد سرور:

> جناب احترام الدین احمد شاغل بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔خود ان کی ساری عمر ادبی مشاغل میں گزری ہے۔انہوں نے جے پور کی ادبی فضاوہاں کے مشاعروں سب کا جائزہ تذکرہ شعرائے جے پور میں سمودیا ہے اس میں کلام نہیں کہ اپنے مواد اور ترتیب کے اعتبار سے اس میں جے پور کی ادبی تاریخ آگئی ہے(۶)

تذکرہ شعرائے جے پور میں جن ۲۲۵ شعراء کا ذکر ہے ان میں بعض ایسے شاعر بھی شامل ہیں جن کے ذکر کے بغیر جے پور کی ادبی تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی۔مثلاً ظہیرؔ دہلوی،خواجہ قمرالدین راقمؔ،حضرت تسلیم نارنولی،مولانا مبینؔ،مائلؔ دہلوی،انورؔ دہلوی، مولانا اطہرؔ ہاپوڑی،مولانا کوثر سندیلوی،اور حضرت قمرؔ واحدی۔مولان نے شعرائے جے پور میں ان تمام شاعروں کو بھی شامل کیا ہے جو ملک کے مختلف حصوں سے یہاں کسب معاش کے سلسلے میں آئے اور شعروادب کی فضا کو خوش گوار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ان کے علاوہ تقسیم ملک کے بعد جو شعراء ترک وطن کرکے پاکستان چلے گئے ان کو بھی شامل تذکرہ کیا گیا ہے۔یہ بات تذکرہ نگار کے فرائض میں نہیں کہ کسی شاعر کو سطحی یا غیر معیاری کہہ کر نظر انداز کردے،ہاں یہ ضرور ہے کہ بیان میں اختصار کو ملحوظ رکھے۔مولانا کا درج ذیل بیان تذکرہ نگاری کے اس تقاضے سے کوسوں دور ہے۔انہوں نے شعراء کو تیکھے طنز کا نشانہ بنا کر اپنے آپ کو شاعر کہنے اور سمجھنے پر نظر ثانی کی دعوت دی ہے:

> شاید میرے بعض کرم فرما جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اپنے آپ کو شاعر سمجھے ہوئے ہیں اپنے حال اس میں نہ پا کر مجھے موردالزام قرار دیں۔میرا مشورہ ان کی خدمت میں یہ ہے کہ وہ اپنے مخلص احباب سے اپنے کلام کا معیار معلوم کرنے کے بعد اپنی نسبت کوئی رائے قائم کریں(۷)

کلی طور پر مولانا کا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں،کیوں کہ انہوں ن ے تذکرے میں کثیر تعداد میں ایسے شعراء کو بھی شامل کیا ہے جن کے بیان میں ان سے چند فقرے بھی ادا نہ ہو سکے اونمونۂ کلام میں بھی تلاش وجستجو کے بعد ایک یا دو شعر سے زائد پیش نہیں کر سکے۔مولانا یہاں بیاض نویس سے ایک قدم بھی آگے نظر نہیں آتے۔ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ کریں:

صافی۔۔۔۔صافی تخلص،عبدالرحمٰن نام،حضرت جوہرؔ سے تلمذ تھا،یہ شعر آپ کا ہے:

حوروں کے طلب گار نہ ہو حضرت زاہد ‌ ‌ ‌ ‌ تم لوگ کہے جاتے ہو مردان خدا میں(۸)

غریبؔ۔۔۔۔غریب تخلص،محمد علی نام،چاند پول اسکول جے پور میں مدرس تھے۔یہ شعر آپ کا ہے:

غریب اس دار محنت میں کسے آرام ملتا ہے مأل غم ہوگا اگر دولت فراہم کی (۹)

ناطقؔ۔۔۔۔ناطق تخلص،سعید اللہ خاں نام،باعلم شخص تھے اور جے پور میں کہیں ملازم تھے۔یہ اشعار ان کے ہیں:

ہیں سب ہوائیں گلشن عالم کی سرسری جو بندھ گئی ہوا وہ نسیم بہار ہے
حسرت نہیں کہ داغ جگر شمع طور ہے گر مر گئے تو واں بھی چراغ مزار ہے (۱۰)

ان مثالوں سے مولانا شاغل کی مختصر بیانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔اس تناظر میں کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کا یہ تذکرہ قدیم تذکروں سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔جس طرح بعض قدیم تذکروں میں اساتذۂ کرام کو بھی چند فقروں میں ہی مقید کر دیا ہے وہی منظر یہاں دعوت نظارہ دیتا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ وہاں تذکرہ نویس،تعصب،رقابت،عداوت اور معاصرانہ چشمکوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور مولانا مواد کی قلت کے سبب اپنے قلم کو آگے نہیں بڑھا سکے۔کیوں کہ جہاں مولانا کو تفصیلات فراہم ہوسکی ہیں وہاں انہوں نے متعلقہ شاعر کے بیان میں مختلف اہم اور غیر اہم قصوں اور وقعات کو بھی شامل کرلیا ہے جو تذکرہ نگار کو زیب نہیں دیتا،بہرحال یہی وہ مقام ہے جہاں مولانا قدیم تذکرہ نگاروں سے بہتر نظر نہیں آتے۔

مولانا کے یہاں واقعہ نگاری کا غلبہ ہے۔اس میں ان کا قلم تذکرہ نگاری کے دیگر تقاضوں کی بہ نسبت زیادہ رواں ہے۔ان کے یہاں قصہ نویسی،داستان گوئی،لطیفہ بیانی اور واقعہ نگاری وافر مقدار میں ہے۔ان واقعات و لطائف کے ذریعے مولانا کے نزدیک فن کار کے افکار و نظریات،زبان و بیان،علم عروض اور فن شاعری پر مہارت و استعداد واضح کرنا مقصود ہے،ان میں مولانا نے کہیں راوی حضرات کا سہارا لیا ہے اور کہیں صیغۂ واحد متکلم کا۔یہ طرز بیان فن تذکرہ نگاری میں چنداں قابل قبول نہیں بہ ایں سبب کہ فن تحقیق و تنقید میں راوی و قصہ گو حضرات قابل اعتماد نہیں،چوں کہ ان کی ذات میں عقیدت و محبت کے جذبات و عناصر کارفرما نظر آتے ہیں اور یہ دونوں پہلو تذکرہ نگاری کے اہم اجزاء میں ہیں۔اس سے قطع نظر ان واقعات و لطائف سے فن کار کی ذہانت،علمیت اور اخلاق و عادات سے متعلق کافی تحقیقی سرمایہ جمع ہوگیا ہے جس کے بغیر شاعر کی شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں تک رسائی ناممکن ہی نہیں بلکہ محال تھی۔یہ مولانا ہی کا کمال ہے کہ انہوں نے چند واقعات میں شعراء کی تصاویر کھینچ کر رکھ دی ہیں۔یہاں مولانا کی قوت حافظہ پر بھی دال ہے۔چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:

محمود علی خاں محمود:۔

آپ کے طبی کارنامے بہت سننے میں آئے مثلاً حاجی شیخ علی کاکوروی راوی ہیں کہ:

میرے ایک عزیز محفوظ علی کو ہچکیوں کا عارضہ ہوگیا بہت سے علاج کرائے مگر فائدہ نہ ہوا تو میں آپ کی خدمت میں

حاضر ہوا آپ نے آ کر مریض کو دیکھا اور کمرے میں ادھر ادھر نظر پھیلائی ایک کونے میں پرانی چٹائی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے کہا کہ ان میں سے تھوڑے سے چلم میں رکھ کر آگ رکھ لاؤ اور مریض کو یہ حقہ پلاؤ۔ چند ہی کش مریض نے لئے تھے کہ سب شکایت رفع ہوگئی (۱۱)

مولانا مبین عثمانی:

ایک بار لوگوں نے بہت زور دیا کہ آپ ہمیشہ رحمت کا بیان کرتے ہیں لوگ نیک عمل سے غافل ہو جائیں گے کبھی غضب کا بھی تو بیان کیجئے۔ آپ نے بادل ناخواستہ اقرار کیا اور دوسری ہی بزم میں غضب الٰہی کا اس شور سے بیان کیا کہ سامعین کے دل ہل گئے اور کئی صاحبان بے ہوش ہو گئے مگر رات ہی کو خواب میں آواز آئی:

سلطان کیا ہماری رحمت اتنی ہی تھی کہ جس کا بیان ختم ہوا۔ اس کے بعد آخر دم تک آپ رحمت و شفاعت کا ہی بیان کرتے رہے کبھی قہر و غضب کا موضوع اختیار نہ کیا (۱۲)

مولان منظور احمد کوثری راوی ہیں کہ:

میں جب بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو وہ کوئی نہ کوئی نہایت اچھا شعر ضرور سنایا کرتے تھے خواہ کسی کا ہو۔ یوم وصال بھی عیادت کو حاضر ہوا اس روز طبیعت زیادہ خراب اور غشی سخت ترین تھی مجھے رستے میں خیال آیا دیکھیں آج بھی مولانا کوئی شعر سناتے ہیں یا نہیں؟ میں پہنچا اور چارپائی کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور اسی انداز سے جو مولانا کے شعر پڑھنے کا تھا یہ شعر پڑھا

رونق عہدِ شباب است دیگر بستاں را   می رسد مژدۂ گل بلبل خوش الحاں را

میں سمجھ گیا کہ وصال قریب ہے اور یہ ارادہ کر کے بیٹھا رہا کہ اب مولانا کے جنازے کے ساتھ ہی یہاں سے اٹھوں گا۔ بعد وصال وہیں بیٹھے بیٹھے مجھ پر غنودگی طاری ہوئی، تو میں نے دیکھا کہ مولانا نہایت سفید لباس پہنے بے حد شاداں و فرحاں تشریف فرما ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا تو وصال ہوگیا، اب کوئی بات پوچھیں بھی تو کس سے؟ فرمایا کیا وقت ہے؟ میں نے عرض کیا کہ فی الحال تو آپ کے ماہ وسال ہی کی فکر ہے۔ فرمایا

ہم نہیں نہ سہی فکر نہ کر اور کہہ دے   می رسد مژدۂ گل بلبل خوش الحاں را

میری آنکھ کھل گئی لفظ 'ہم' اور 'فکر' کا مصرعہ 'می رسد مژدۂ گل بلبل خوش الحاں را' کے اعداد کے تخرجہ کیا تو سن وصال ۱۳۳۶ھ برآمد ہوگیا (۱۳)

سید اولاد حسین رسوا:

ایک بار کہیں سفر کر رہے تھے رہزنوں نے مسافروں کو آ گھیرا، تمام مسافروں کا سامان چھین لیا آپ سے پوچھا بتا تیرے پاس کیا ہے تو کہنے لگے میرے پاس کیا ہے میں تو میراثی ہوں، ڈاکوؤں نے کہا 'میراثی ہے تو گانا سنا' آپ نے فوراً گانا شروع کر دیا اور رنرت بھی ایسے کئے کہ ڈاکوؤں نے واقعی میراثی سمجھ لیا اور کچھ انعام و اکرام دے کر چھوڑ دیا (۱۴)

تذکرے کے عمیق مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا تحقیقی و تاریخی شعور بیدار تھا موصوف کسی بھی قیمت پر تحقیقی و تاریخی شواہد کی حصولیابی کے لئے کوشاں رہے اور اس امر میں خاطر خواہ کامیابی سے ہمکنار بھی ہوئے۔ تاہم چند مقامات ایسے بھی نظر آتے ہیں جہاں قیاس آرائی پر اکتفا کیا گیا ہے چنانچہ، اغلبا، تقریباً اور قریب قریب جیسے الفاظ کا سہارا اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔ اسی طرح تحقیق میں بھی مولانا قیاسی نتائج اخذ کر کے اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ مثلاً 'صاحب دیوان تھے اور بہت اچھا کہتے تھے اب وہ دیوان نایاب ہے'۔ مولانا ایسے مقامات پر دواوین کے ذکر میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کا بھی فرق واضح نہیں کرتے لیکن ان کے طرز بیان سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس طرح کے دواوین نہ زیور طباعت سے آراستہ ہو سکے اور نہ ہی ان کی نظر سے گزر سکے۔

تحقیق میں قیاسی فیصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ایک محقق کو بغیر شواہد کے لفظ 'تھا' یا 'تھے' کے استعمال کی اجازت نہیں۔ کیونکہ لغت تحقیق میں ایسے الفاظ کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ یہ الفاظ وہاں پر مہمل قرار دیئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مولانا کے یہاں تحقیقی و تاریخی شعور کا فقدان ہے۔ انھوں نے اپنی معلومات اور کاوشوں سے تذکرے میں کافی تحقیقی و تاریخی مواد جمع کر دیا ہے۔ تذکرے میں ایسے مقامات بہت کم ہیں جہاں چشم پوشی کی گئی ہو یا قیاسی بیانات کا سہارا لے کر مولانا آگے بڑھتے ہوئے اپنی بات کہہ گئے ہیں۔ اگر موصوف تفصیل میں نہ جا کر اختصار سے اپنی بات پیش کرتے اور تحقیقی و تاریخی بیانات میں سنین وشواہد پر اپنی توجہ صرف کرتے تو یہ تذکرہ 'آنچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر' کے مصداق ہوتا۔ تذکرے سے چند اقتباسات بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:

یہ دیوان میرے پاس ہے اور اس کے ملنے کی صورت یہ ہوئی کہ ایک روز اس کے ورق کی پڑیا بندھی ہوئی میں نے دیکھی تو چونکا، معلومات پر جس پنساری کے یہاں سے یہ کاغذ آیا تھا اس کی دوکان پر پہنچا، تو دیوان موجود تھا چند پیسوں میں خرید لایا اور جلد بندھوا کر محفوظ کر لیا (۱۵)

کہتے بہت تھے مگر معیاری شعر بہت کم ہوتے تھے دیوان مکمل تھا مگر اب پتہ نہیں ساٹھ یا باسٹھ برس کی عمر میں انتقال کیا (۱۶)

آپ نے اپنی یادگار ایک ضخیم دیوان چھوڑا تھا جس کا چھپنا تو ضرور دشوار تھا مگر افسوس کہ آپ کے وارث اس کو محفوظ

بھی نہ رکھ سکے۔کہا جاتا ہے کہ آپ کے بعض شاگردوں نے اس کے حصے بخرے کر لئے۔واللہ اعلم بالصواب(۱۷)

اختر تخلص محمد اختر یار بیگ نام،نسباً مغل اوراصل وطن فرید آباد۔چونکہ مرزا اسد یار بیگ دیوان چھتیس کارخانہ ریاست جے پور کے قریبی عزیز تھے اسی تعلق سے یہاں آئے اورانھیں کی حویلی واقع محلّہ پیپلی کاٹیان میں تمام عمر رہے۔مختلف محکمات میں ملازمت بھی کی اور یہیں انتقال ہوا(۱۸)

تقریباً ۶۵ سال کی عمر میں،اغلباً ۱۹۴۴ء میں جے پور ہی میں انتقال ہوا،ایک اچھا خاصا ضخیم مجموعۂ کلام چھوڑا تھا مگر اب وہ نایاب ہے(۱۹)

آپ ایک پرگواور خوش فکر شاعر تھے رنگینیٔ طبع اپنا رنگ دکھاجاتی تھی دیوان تقریباً مکمل تھا مگر کچھ پتہ نہیں کہ اب کہیں ہے بھی یا نہیں(۲۰)

قمر ۱۸۹۳ء،۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے(۲۱)ابتدائی تعلیم اپنے برادر محترم عبداللہ خاں اور محمد شریف کاتب بال چندر پریس سے پائی(۲۲)

کلیات مرتب تھا جس میں شاید ہی کوئی صنف سخن نہ ہومگر اب نہ یہاں کسی کلام کا پتہ ہے نہ پاکستان میں آپ کے صاحب زادوں اوراعزہ کے پاس ہے۔صرف ایک شعر بہ مشکل دستیاب ہوا اسی پر اکتفا کرنا پڑا(۲۳)

مولانا کا تنقیدی شعور تحقیقی وتاریخی شعور کی بہ نسبت قدرے مستحکم ہے،ناقد دوٹوک الفاظ میں اپنی رائے پیش کرتا ہے۔اس کے یہاں انشاپردازی یا عبارت آرائی کا گزر نہیں اس لئے تنقید میں جوطرز بیان اختیار کیا جاتا ہے وہ راست ہوتا ہے۔مولانا شاغل ایک ناقد کے فرائض سے بخوبی واقف ہیں،انھوں نے اپنی آراء میں لفظوں کے پیچ وخم سے احتراز برتا ہے اور چند فقروں میں اپنی بات کہہ گئے ہیں۔کلام پرنقد وتبصرہ کے ذیل میں بیانات میں یکسانیت ہے جوقدیم تذکراتی ادب میں بھی دیکھنے کوملتی ہے،یہ یکسانیت اس حد تک ہے کہ اگر شعراء کا نام بدل دیا جائے اور رائے کوجوں کا توں رکھا جائے تب بھی کوئی فرق محسوس نہیں کیا جاسکتا،یہ ان کے تنقیدی شعور کا ایک کمزور پہلو ہے،تذکرے سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں

آگاہ:

زبان کی صفائی،صحت الفاظ ومحاورہ،چست بندش اورروانی وتاثیر کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔نشست الفاظ کا خاص ملکہ ہے بلند پردازی بھی پورے طور پر نمایاں ہے(۲۴)

احسان:

زبان شستہ اورانداز بیان صاف ہوتا ہے اورنشست الفاظ مضبوط(۲۵)

احمرؔ:

آپ کے کلام میں زور بلند پردازی اور شوکت الفاظ پائی جاتی ہے(۲۶)

اخترؔ:

زبان نہایتا آسان و شستہ طرز بیان رواں اور سادہ مضمون آفرینی اور بلند پردازی سے زیادہ تاثیر کا خیال رکھتے ہیں نشست الفاظ پر قدرت ہے، بندش چست ہوتی ہیں اور محاورے درست و برمحل استعمال کرتے ہیں(۲۷)

اعجازؔ:

زبان کی صحت، مضمون کی بلندی، خوبصورت تراکیب روانی کے ساتھ مضمون آفرینی اور تاثیر کا لحاظ آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں(۲۸)

افضلؔ:

سلیس زبان اور سادہ طرز بیان آپ کے کلام کی جان ہے(۲۹)

امینؔ:

بلند پردازی، شوخی اور مضمون آفرینی کی سعی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں(۳۰)

چھیترمل شمیمؔ:

شوخی و مضمون آفرینی اور زبان کا چٹخارہ آپ کے یہاں پایا جاتا ہے(۳۱)

عابدؔ:

زبان نہایت سادہ، سلیس، بندشیں چست، مضمون آفرینی کے ساتھ ندرت بیان اور دلکش انداز کلام آپ کے یہاں بکثرت ملتا ہے(۳۲)

نواب محمد مکرم علی خاں مکرمؔ:

آپ کے کلام میں شستہ زبان، سلیس اسلوب بیان، روانی و برجستگی، مضمون آفرینی، چست بندشیں اور حسین ترکیبیں بہ کثرت ملتی ہیں(۳۳)

خورشید علی مہرؔ:

کلام میں زور ہے روانی ہے، چست بندشوں اور خوبصورت ترکیبوں پر زیادہ توجہ صرف کرت ہیں۔ندرت تخیل بھی ہے اور مضمون آفرینی و بلند پردازی بھی، زبان صاف شستہ استعمال کرتے ہیں(۳۴)

تذکرہ شعرائے جے پور راجستھان میں اردو تذکرہ نگاری کے باب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔اس کے غائر مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مرتب کو تذکرہ نگاری کے فنی تقاضوں سے خوب واقفیت ہے زبان و بیان بھی موضوع کے عین مطابق ہے لیکن یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فاضل تذکرہ نگار بعض مقامات پر فنی تقاضوں سے تجاوز کر گئے ہیں۔تذکرہ نویس کو مؤرخ کی مفصل نگاری اور بیاض نویسی کی مجمل بیانی دونوں ہی سے احتراز لازمی ہے،اسے راہ اعتدال اختیار کرنا ہوتا ہے جب کہ مولانا تذکرہ نگاری کی حدود تجاوز کر کے مفصل بیانی میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ایک مؤرخ کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔مثلاً تذکرۂ ہٰذا میں حضرت تسلیم نارنولی، مائلؔ دہلوی، مولانا مبینؔ، مولوی اطہرؔ ہاپوڑی اور مولان کوثر سندیلوی کے ذکر میں متعدد صفحات رنگ دیئے ہیں اس طرح کا تفصیلی بیان تذکرے کو تاریخ کے درجے میں داخل کر دیتا ہے۔بیاض نویس کی اختصار بیانی کی مثالیں چنداں ضروری نہیں چونکہ گذشتہ صفحات میں اہم اور غیر اہم شعراء کے ذکر میں جو مثالیں پیش کی جا چکی ہیں بیاض نویسی کے زمرے ہی میں داخل ہیں۔ان چند مثالوں سے قطع نظر بیشتر متذکرہ شعراء کے بیان میں اعتدال کی راہ اختیار کی گئی ہے۔

بہ اعتبار مجموعی تذکرہ شعرائے جے پور، فنی نقطۂ نگاہ سے ایک معیاری اور مکمل تذکرہ ہے جو چند معائب و نقائص سے قطع نظر فنی و ادبی اوصاف و محاسن سے مزین ہے۔بقول ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی

> یہ تذکرہ جے پور میں شعر و سخن کے آغاز و ارتقاء کی ایک ایسی بیش بہا تاریخی دستاویز ہے جسے آج تحقیق کے لئے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے(۳۵)

☆☆☆☆☆

حوالہ جات :

(۱) تعارف دیوان شاغل جلد اول (۲) تعارف تذکرہ شعرائے جے پور

(۳) تذکرہ شعرائے جے پور ص ۵۱ (۴) تعارف تذکرۂ ہٰذا از آل احمد سرور

(۵) مولای عبدالحق نے جائزہ زبان اردو میں جے پور کے مدرسے کے قیام کا سنہ ۱۸۴۴ء تحریر کیا ہے یہی مدرسہ آگے چل کر جے پور کالج کے نام سے موسوم ہوا تھا (راقم)

(۶) تعارف تذکرۂ ہٰذا از آل احمد سرور (۷) تذکرۂ ہٰذا ص ۵۱

(۸) ایضاً ص ۳۰۳ (۹) ایضاً ص ۳۴۷

(۱۰) ایضاً ص ۴۸۶ (۱۱) ایضاً ص ۴۵۶

(۱۲) ایضاً ص ۴۳۱ (۱۳) ایضاً ص ۴۲-۴۴۱

(۱۴)ایضاص۳۴۰

(۱۵)ایضاص۷۱۔۷۰

(۱۶)ایضاص۵۳

(۱۷)ایضاص۵۶

(۱۸)ایضاص۶۶

(۱۹)ایضاص۹۴

(۲۰)ایضاص۱۱۰

(۲۱)جدید تحقیق کے مطابق یہ دونوں سنین غلط ثابت ہو چکی ہیں،صحیح سنہ پیدائش یکم دسمبر ۱۸۸۷ء بمطابق ۱۳۰۵ھ ہے ملاحظہ ہوسہ ماہی نخلستان،مولانا قمر واحدی نمبر،شمارہ نمبر۲ جلد۱۲، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۱ء،راجستھان اردو اکادمی جے پور(راقم)

(۲۲) تذکرۂ ہذا ص ۳۷۵

(۲۳)ایضاص۵۰۰

(۲۴)ایضاص۵۷

(۲۵)ایضاص۶۴

(۲۶)ایضاص۶۵

(۲۷)ایضاص۶۸

(۲۸)ایضاص۹۵

(۲۹)ایضاص۹۷

(۳۰)ایضاص۱۰۴

(۳۱)ایضاص۲۸۵

(۳۲)ایضاص۳۲۲

(۳۳)ایضاص۴۶۸۔۴۶۷

(۳۴)ایضاص۴۸۱

(۳۶)مقدمہ۔تذکرہ وکلام معاصر سخن وران جے پور،ص۴

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر حسن مثنیٰ عشق انیس

رئیس احمد جارچوی

میر انیس مرثیہ نگاری میں نقطۂ ختم سمجھے جاتے ہیں۔ جب کبھی اردو مرثیہ زیر بحث آتا ہے یہی نام ہے جو سرفہرست آتا ہے اور مرثیہ نگاری میں بطور سرخی لکھا جاتا ہے اور واقعی میر انیس نے مرثیہ کو نہ صرف بام عروج پر پہنچایا بلکہ ادبی دنیا میں مرثیہ کو وہ حیثیت بخش دی کہ تمام اصناف شعر و سخن کی نگاہیں اس پر ٹکی ہوئی ہیں۔ ہر عہد کے ادباء نے اس بحر ذخار میں غوطہ لگانے کی کوشش کی اور اپنے عزم و ہمت کے مطابق گوہر آبدار نکالے ہیں۔ ان میں بعض ایسے تھے کہ جو میر انیس کی عظیم شخصیت سے نہ صرف متأثر ہوئے بلکہ انھیں اپنا راہ نما اور قبلہ و کعبہ تسلیم کر لیا۔ انھیں میں ایک نام ادبی سطح پر ابھر کر آیا جسے حسن مثنیٰ کہتے ہیں۔

ڈاکٹر حسن مثنیٰ کو میر انیس سے صرف عقیدت نہیں تھی بلکہ ایسا عشق تھا جو ہر مصرعہ میں کسی حسن اور خوبی کو تلاش کرتا تھا اور کمال یہ ہے کہ وہ اس خوبی کو پا لیتے تھے جب کہ مصرعہ کے اسلوب کو سمجھنا آسان نہیں ہے پھر اس کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچنا کارے دارد۔ مصرعہ کی ساخت اور اس میں استعمال ہونے والی صفت، تشبیہ اور استعارہ سے مفہوم کو اخذ کرنا انتہائی مشکل کام ہے لیکن ادبی ذوق اور رثائی ادب کا شعور ہی اس مشکل کو آسان کرتا ہے۔ بحمد اللہ ڈاکٹر حسن مثنیٰ میں یہ شعور بدرجۂ اتم تھا۔ انھیں مرثیہ سے لگاؤ تھا اور اسی خاص لگاؤ کی وجہ سے انہوں نے مرثیہ سنا، پڑھا اور مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مرثیہ وہ صنف سخن ہے جس میں سب کچھ سمو دیا گیا ہے۔ ان کا یہ خیال کافی حد تک درست ہے کہ

> 'اردو کی تمام اصناف سخن میں مرثیہ ہی وہ واحد صنف ہے، جس میں ہر دور کے شعراء نے اخلاق و کردار کے ایسے ایسے شیڈس پیش کئے ہیں جس کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو ہمارے ہی سماج کے عکاس ہیں میرے خیال میں انیس و دبیر یا دیگر شعراء یہ کارنامہ اس لئے انجام دے گئے کہ ان سبھوں نے اس واقعہ کو حد درجہ احترام اور خلوص کے ساتھ دیکھا اور برتا ہے(۱)

حسن مثنیٰ کے نزدیک مرثیہ ہی ایسی صنف ہے جس کے دامن ادبیت کی پہنائیوں میں سب کچھ سمٹ سکتا ہے۔ اخلاق و کردار کے بلند پیرائے مرثیہ میں ہی بیان کئے جا سکتے ہیں، کسی دوسری صنف میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔ موصوف کو مرثیہ سے جذباتی اور پیدائش لگاؤ ہے انہوں نے جب شعور کی دہلیز پر قدم بھی نہیں رکھا تھا تب سے ان کا ربط مرثیہ سے قائم ہو گیا اس لئے کہ موصوف جس گھرانے میں پیدا ہوئے وہاں ہر وقت نوحوں اور مرثیوں کی گونج سنائی دیتی تھی اس فضا میں حسن مثنیٰ پروان چڑھے اور مرثیت ان کے مزاج میں رچ بس گئی ایسا ہونا حیرت انگیز بھی نہیں ہے کیوں کہ موصوف کے والد اچھی وضع قطع کے عزادار تھے اور ماہ محرم میں

مجالس امام حسین کا انعقاد کرنا اور مجالس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا محمد نعیم صاحب کی فطرت ثانیہ تھی یا ان کی فطرت کا تقاضہ تھا۔وہی تعلیم موصوف نے اپنے بچوں کو دی یہاں تک کہ مجالس کی خود بھی زینت بنتے تھے اور بچوں کو بھی عزا سے قریب کرتے تھے اس منظر کو تربیتی انداز میں بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر حسن مثنیٰ رقم طراز ہیں:

> میں نے اس کام کو پایۂ تکمیل پہنچانے کے لئے کہاں کہاں سے Inspiration لیا ہے اس کا اندازہ کر پانا میرے بس میں نہیں لیکن اتنی بات تو طے ہے کہ اس کے بیج میرے شعور و وجدان میں شاید اس وقت سے موجود تھے جب میں نے پہلی بار اپنے وطن میں مرثیہ سننا بلکہ سمجھنا شروع کیا تھا،اسے میرے والد کی عطا بھی سمجھنا چاہئے،وہ مجھے ان مجلسوں میں ضرور لے جاتے تھے جہاں مرثیہ خوانی ہوا کرتی تھی (۲)

اسی صفحہ پر کچھ آگے چل کر حسن مثنیٰ مرثیہ سے اپنے والہانہ پن کی مزید وضاحت کرتے ہیں

> مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ کوئی Inspiration یا تحریک ایک بیج کے سوا کچھ بھی نہیں ہوا کرتی اسے گل وگلزار ہونے میں،ایک حتمی شکل پانے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔یہ بیج مجھ میں اس وقت سے موجود تھا۔۔ہاں اسے اپنی حقیقی شکل میں ظہور پذیر ہونے میں خاصہ وقت اس لئے لگا کہ میری مٹی اس قدر زرخیز نہیں کہ کوئی بیج بہت جلد تناور درخت بن جائے (۳)

موصوف نے جہاں مرثیہ سے اپنے فطری لگاؤ کی وضاحت کی ہے وہیں یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ بچپن کی فکری صلاحیتوں میں اور جوانی کی پختہ فکر میں کتنا فرق ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ انہیں مرثیت سے ایک خصوصی ربط بچپن ہی سے تھا لیکن میدان عمل اور فکری تجربے نے اسے جوانی کے شعور میں ڈھال دیا یہ بھی ان کی منکسر المزاجی ہے کہ 'میری مٹی اس قدر زرخیز نہیں۔۔۔' ورنہ انہوں نے عمر کے ابتدائی حصہ میں ہی مرثیہ سے پختہ اور اٹوٹ ربط پیدا کرلیا تھا چنانچہ انیس و دبیر دوسو سالہ عالمی سیمینار میں حسن مثنیٰ نے یادگار مقالہ پیش کر کے نہ صرف اپنی پہچان بنائی بلکہ مرثیہ سے اپنے ربط کی علی الاعلام وضاحت کردی۔یہ وہ وقت تھا جب وہ شعور کی دہلیز کو پار کررہے تھے اور جے این یو دہلی میں طالبانہ سرگرمیوں سے وابستہ تھے بقول خود حسن مثنیٰ کے کہ انہوں نے یہ کام پروفیسر گوپی چند نارنگ کی دعوت پر کیا اس کا واضح سا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی جہاں دیدہ آنکھوں سے حسن مثنیٰ میں مرثیہ سے ربط کو محسوس کرلیا تھا اور خاص طور پر میر انیس سے والہانہ وابستگی کا انھیں پتہ چل گیا تھا اور ہوا بھی ایسا ہی کہ جب انیس شناسوں کے درمیان حسن مثنیٰ نے اپنا مقالہ پیش کیا تو تمام اہل نظر نے نہ صرف سراہا بلکہ حلقۂ انیس میں شامل کرلیا۔

ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے کئی مقالے مختلف جہتوں سے میر انیس کی شاعری کی نذر کئے اور اپنی فکری صلاحیتوں کو میر انیس کے مرثیوں میں غرق کیا اور پھر ایسے گوہر آبدار لے کر برآمد ہوئے کہ وہ گوہر دنیائے ادب کے لئے ناقابل فراموش سرمایہ بن گئے۔

ایک مقالہ'مراثی انیس میں انسان سازی کے عناصر'قلم بند کیا یقیناً یہ مقالہ اپنی جگہ سنگ میل ہے جملہ اصناف سخن میں مرثیہ کی بالادستی کا ثبوت ہے۔صدیوں سے ایک مسلسل آواز کہ جو کردار ساز ہونے کی بناء پر فطرت کا تقاضہ بھی ہے اور پرکشش بھی ہے اور فروع دین کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شکل میں مستقل دعوت بھی ہے

اپنے مقالے کی ابتداء میں موصوف لکھتے ہیں

مرثیہ اپنے اندر جہاں ایک طرف جملہ اصناف شعروادب کی لسانی تہذیبی معاشرتی خصوصیات کو سموئے ہوئے ہے وہیں اس میں انسان سازی کے اہم ترین عناصر مثلاً شجاعت وسخاوت،اطاعت وفرمانبرداری یا عفو وکرم،احسان شناسی،حسن سلوک،صلہ رحمی،مہر ووفا،صبر ورضا،جذبۂ اتحاد ویگانگت،حلم وبردباری،یا سپاس گذاری اور انکساری وغیرہ بھی بکھرے پڑے ہیں(۴)

حسن مثنیٰ یہ مانتے ہیں کہ مرثیہ ایسی نظم ہے جس میں یہ تمام پہلو کہ جن سے انسان سازی یا کردار سازی ہو سکتی ہے، کے لئے اہم ترین میدان ہے چنان چہ اس مقالے میں آگے چل کر بیان کرتے ہیں

میں یہ دعویٰ صرف اس لئے کر پا رہا ہوں کہ اس سے قبل اردو کی شعری کائنات میں اخلاق وکردار کے علاوہ انسان سازی کی ایسی عملی فضا کہیں اور نہیں تخلیق کی جا سکی ہے(۵)

کچھ آگے اس کی وجہ بیان کرتے ہیں:

کسی بھی ادیب وشاعر کی شاعری یا ادب اس کے اپنے تجربے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا(۶)

یہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے مگر اپنے اندر معانی ومفاہیم کی وسیع وعریض دنیا کو سموئے ہوئے ہے۔اس طرح کے جملے بڑے علمی وفکری تجربے کے بعد قلم کی زبان سے بیساختہ نکلتے ہیں اور بیساختگی کی وجہ ادبی دنیا میں جرأت مندانہ اقدام ہے۔یہ رائے قابل احترام بھی ہے اور تجزیئے کے قابل بھی ہے۔اس رائے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے ادبی دنیا میں اس طرح کے خیالات اور آراء کی بناء پر قدم جمائے اور کم عمری میں ہی علمی وادبی دنیا میں ایک اچھی شناخت بھی قائم کی اور گرفت بھی بنائی۔ادبی دنیا میں جہاں اچھے ادیب کے نام سے جانے اور مانے گئے وہیں مرثیہ اور میر انیس کے نام سے پہچانے گئے اور مرثیہ سے وہ گوشے پیدا کئے جو بہرحال تشنۂ تحریر واظہار تھے یہی نہیں کہ وہ خود صائب الرائے تھے بلکہ کسی بھی اچھی رائے کو اپنی تحریروں کا حصہ بنا لیتے تھے واقعۂ کربلا اور اس سے گہرے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے صالحہ عابد حسین کے خیال کو بعینہ نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں۔لیکن ہم پہلے صالحہ عابد حسین کا خیال تحریر کر کے موصوف کی رائے نقل کریں گے

صالحہ عابد حسین فرماتی ہیں

میر انیس کے یہاں ہمیں جو گہری عقیدت، خلوص اور جوش نظر آتا ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ شاعر خود دل و جان سے ان قدروں پر ایمان رکھتا ہے جن کا وہ ذکر کر رہا ہے(۷)

حسن مثنیٰ:

انیس نے اگر ایک عظیم موضوع کی مناسبت سے اپنے موئے قلم کو جنبش دی تھی تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس سے حسینی مشن کو استحکام بخشا جا سکے، اسے فروغ دیا جا سکے(۸)

اسی بیان کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جنگ کربلا ایسی عظیم جنگ ہے جہاں انسان سازی کا عمل انجام دیا گیا، جہاں دشمن کو بھی عالم تشنگی میں سیراب کرنے کا سلیقہ سکھایا گیا، یہ حسینی شیوہ تھا، یہ حسینی اقدار تھے جس کی بدولت اس واقعہ کی یاد آج بھی ہمارے ذہنوں پر قائم ہے(۹)

حسن مثنیٰ کو مرثیہ سے جذباتی لگاؤ اور گہری دلچسپی تھی اس لئے مرثیہ اور علی الخصوص مراثی انیس نے ان کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے اور انہوں نے انیس کے مراثی سے کچھ ایسے موضوعات تراشے کہ کو سماجی و معاشرتی نظام کے لئے سودمند بھی ہوں اور ایک بہتر معاشرے کی تشکیل میں اس کی بنیادوں کو مضبوط تر بنا دیں۔

جیسا کہ انہوں نے انسان سازی جیسا موضوع تلاش کر لیا لیکن انسان سازی کے سوتے کہاں سے پھوٹتے ہیں اسے بھی تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی اور ایک مضمون قلم بند کیا کہ جس کی سرخی قرار دی 'مراثی انیس میں ماں کا کردار' ظاہر ہے کہ ماں ایسا سوتا ہے کہ جس سے مختلف چشمے پھوٹتے ہیں ہر بچہ کی تربیت و برداخت میں ماں کی فطرت اور مزاج کا بڑا دخل ہوتا ہے، ماں کی عادتیں اور مزاج شیر مادر اور گھٹی کے ساتھ بچہ میں سرایت کرتی ہیں۔ میر انیس کے اندر انسان سازی اور واقعۂ کربلا سے گہری عقیدت ومحبت ان کی ماں کی طرف سے آنا فطری تھی، اس فطری عمل کو حسن مثنیٰ اس طرح بیان کرتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ جو ادب و آداب، طور وطریق، تہذیب و شائستگی، خودداری، شرافت، مذہبی عقیدت وغیرہ جوان میں موجود تھی وہ ایک ماں کی تربیت کا ہی نتیجہ تھی(۱۰)

حالاں کہ اس سے زیادہ صائب رائے صالحہ عابد حسین کی ہے جسے خود اپنے مقالے میں نقل کر چکے ہیں۔ حسن مثنیٰ کی نظر میں ماں ہی ایک ایسا کردار ہے جس کے آئینے میں ہر بچہ اپنی تصویر دیکھتا ہے چنانچہ رقم طراز ہیں:

دنیا کے تمام رشتوں میں ماں کا رشتہ ہی شاید سب سے زیادہ selfless رشتہ ہے جہاں پانے کی چاہ سے زیادہ دینے کی خواہشیں کروٹیں لیتی رہتی ہیں(۱۱)

اس سے کچھ سطریں پہلے لکھتے ہیں:

جب یہ لفظ (ماں) ہمارے ذہن ودل کے پردے پر ابھرتا ہے تب ایک ایسی شخصیت کا تصور کوند کر آتا ہے جہاں عظمت ورفعت اور محبت وایثار وہمدردی کا احساس موجزن نظر آتا ہے (۱۲)

میر انیس نے ماں کے کردار کو اپنے کلام میں پیش کیا لیکن ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے اسے موضوع بحث قرار دے کر تحریر کا رخ موڑ دیا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں ان کی ماں کی مجلس چہلم سے خطاب کے لئے گوپال پور گیا تو وہ ماں کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر روئے آج ہم سب اس جوان العمر ادیب کے لئے گریاں ہیں کہ جس کی تحریریں یادیں بن گئی ہیں

جانے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

حوالے:

(۱) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۶۹
(۲) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۱۲
(۳) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۱۲
(۴) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۶۹
(۵) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۷۰
(۶) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۷۰
(۷) خواتین کربلا کا۔۔۔انیس کے آئینہ میں ص ۳
(۸) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۷۱
(۹) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۷۱
(۱۰) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۷۱
(۱۱) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۵۳
(۱۲) انیس اور انیس شناس از حسن مثنیٰ ص ۲۵۳

☆☆☆☆☆

فیض اور مخدوم

ڈاکٹرعزیز رضا

اسٹنٹ پروفیسرشعبۂ اردو

جواہرلال نہرو پی.جی کالج بارہ بنکی

مخدوم کی شاعری کا آغاز عام طور پر پیلا دوشالہ سے ہوتا ہے جو ایک تفریحی نظم ہے 'سرخ سویرا' میں پہلی نظم 'طور' ہے یہ نظم رومانی ہے لیکن ان دس سالہ یا گیارہ سالہ ابتدائی دور شاعری میں ان کے یہاں ایک بھی غزل نہیں ملتی ہے تقریباً ۱۰ برس کے بعد گل تر کی اشاعت عمل میں آئی جس میں ان کی ۱۹ غزلیں ہیں اور بساط رقص میں دو غزلیں ملتی ہیں 'سرخ سویرا' کی شاعری میں مخدوم کا لہجہ رومان اور انقلاب کی لہر لئے ہوئے ملتا ہے جس میں کچھ تو ہم عصروں کی یکسانیت ہے اور کچھ ان کی انفرادیت بھی ہے۔سرخ سویرا کی پہلی نظم طور ہے جس میں ان کے رومانی جذبے کا اظہار روایتی انداز میں ضرور ملتا ہے مگر اس میں انفرادیت کی تازگی بھی پائی جاتی ہے۔طور ویسے تو ان کی رومانی نظم ہے لیکن یہ نظم حصار غزل سے آزاد نہیں ہے اس میں جو رنگ تغزل ہے وہ صنف نازک کے قریب ہے۔ایسا لگتا ہے کہ چند مصرعے غزل کے اس میں تنہا رہ گئے ہیں وہ مصرعے پیش ہیں ع

(۱) یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے

(۲) خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

(۳) لبوں کی مئے پلانے جھومتا مست شباب آیا

(۴) جو چھو لیتا تھا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں

(۵) ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی

میرا خیال ہے کہ یہ مصرعے اگر غزل کے شعر بنتے تو بڑے پاورفل اور اچھوتے اشعار ہوتے اس لئے کہ ان کے اندر جو غنائیت، سرشاری اور خودسپردگی کی کیفیت ہے وہ غزل کا ایک خاص حصہ ہے۔ان جیسے چند اور مصرعے پیش ہیں جن میں غزل کہی جاسکتی تھی یا وہ غزل کے شعر بن سکتے تھے ع

سرچشمے محبت کے مسرت کے خزانے

کچھ شعلہ بدن پانی میں اترے تھے نہانے

راگ سننے رک گئے ہیں بادلوں کے کارواں

جلوے صبح وشام کے ہوتے ہیں تجھ سے،ہم کلام
آگ ہوں آگ بس اب آگ لگادے مجھ کو
ساز نے انگڑائی لی بجنے لگی ہیں تالیاں
نیندسی آنکھوں میں آتی ہے جھکا جاتا ہے سر
میرے رہنے کا جہان جاودانی اور ہے
دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں میں رہتا ہوں میں
رندشب بیدار، جاسوجا، سیاہی اوڑھ کر
زندگی کی اب کہیں ہلچل نظر آتی نہیں
سرخ آنکھوں میں آنچلوں کے کنارے
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
تھرتھراتے ہوئے شبھے ہوئے گھبرائے سے
ابھر رہی ہے نئے آفتاب کی دنیا

اگران مصرعوں کوغزل کی فارم مین برتا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ ان کے اندر وہ خوبی موجود تھی کہ ان سے غزل کے اچھے اشعار نکل آتے اس لئے کہ ان مصرعوں میں غزل کی سادگی و پرکاری،مسرت و بہجت،سوز وگداز اورایجاز واختصار سب کچھ موجود ہے مثلا طور کا یہ مصرعہ

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

عہد جدید کے مشہور غزل گو بشیر بدر نے جب اس سے فیض اٹھا کر غزل کا شعر کہا تو ان کے شعر کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ڈاکٹر عطاالرحمان اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں

’یہ اختر شیرانی کا راستی تھا ہی نہیں بلکہ یہ بات مخدوم نے اردو میں پہلی بار کہی تھی۔اپنے موضوعاتی واسلوبیاتی سلیقے میں یہ انداز اس قدر انوکھا ہے کہ مخدوم کے شعر کہنے کے کم وبیش ۴۵ سال بعد بشیر بدر نے جب یہ لکھا‘

نہا رہی ہے زمیں چاندنی کے پھولوں سے — خدا کسی کی محبت پہ مسکراتا ہے

تو اس شعر کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اوراپنے زمانے کے بہت مقبول اشعار میں اس کا شمار ہوتا ہے جب کہ مخدوم نے آج سے ۴۵ سال قبل اپنی شاعری کا آغاز ہی اسی سے کیا تھا اور مخدوم کا مصرعہ بشیر بدر کے اس شعر سے زیادہ اثر رکھنے والا ہے۔۔۔۔ع

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہ تنہا مصرعوں کی بات ہے جن میں اتنی کشش اور قوت ہے کہ اگر ان سے شعر مکمل ہوتے (شعر کے معنی میری مراد غزل سے ہے) تو یقیناً انداز گفتگو کچھ اور ہوتا۔ مخدوم کے پہلے شعری مجموعہ 'سرخ سویرا' میں کچھ ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو نظموں میں بیان تو ہوئے ہیں لیکن ان میں غزل کی کسک موجود ہے۔ ان کی نظموں کے غزل نما اشعار ملاحظہ ہوں:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو، کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا باہوں میں

شانے پہ پریشاں ہونے کو بے چین سیہ کاکل کی گھٹا
پیشانی میں طوفاں سجدوں کا، لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں

آنسو کا ڈھلک کر رہ جانا، خوں گشتہ دلوں کا نذرانہ
تکمیل وفا کا افسانہ کہہ جانا آنکھوں آنکھوں میں

تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دھڑکتے دل سے
تیرے رخ سے ترے آنچل کو ہٹانا ہی پڑا

جس پیکر لذت سے عبارت ہے مسرت
وہ ہمدم دیرینہ بچھڑ جائے ستم ہے

حیات نو مجھے آواز دے رہی ہے سنو
دبی زبان میں کچھ گنگنا رہا ہے قمر

کہاں ہے ساقی گل رو کہاں ہے سرخ شراب
فسانہ غم گیتی سنا رہا ہے قمر

شب کے سناٹے میں چپکے چپکے رولینا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے لب پر مناجاتیں نہ تھیں
جب حریم دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ

چاندنی راتیں تھیں ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

مندرجہ بالا اشعارغزل کے نہ سہی لیکن ان میں کیا غزلوں کی ادائیں نہیں ملتی ہیں؟ اگر کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ اشعار مخدوم کی نظموں کے ہیں تو میرے خیال میں شاید ہی کوئی ناقد، ادیب یا شاعر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار غزل کے نہیں ہیں۔ میں نے مخدوم کی غزل گوئی کے تحت ان اشعار کو اس لئے پیش کیا کہ کم از کم یہ واضح کر سکوں کہ سرخ سویرا میں یہ بات سچ ہے کہ مخدوم نے ایک غزل بھی نہیں کہی مگر ان کے اندر غزل گوئی کے مادے موجود تھے جسے وقت کی رفتار نے روند دیا اور آخر کار عمر کے آخری حصے میں انھیں اس طرف ہجرت کرنے کی ضرورت آ ہی پڑی۔

مخدوم اپنی غزل گوئی کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

غزل کہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں سواس کے داخلی محرکات جمع ہوتے ہوتے ایک دن غزل کی صورت میں بہہ نکلے

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مخدوم اگر غزل نہ کہتے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرتے پھر بھی اس طرف مراجعت کرنے میں انھوں نے کافی تاخیر کی۔ مخدوم کی اکیس غزلوں پر شاذ تمکنت یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اکیس غزلیں شاعری کی کائنات سال وسن میں جو کمیت کے اعتبار سے کم اور کیفیت کے معیار سے قابل لحاظ ہیں

ان غزلوں پر ترقی پسند غزل کے انتہا پسند دور کی چھاپ ہے نہ یہ جدید غزل ہے اور یہ طرز میؔر ہے نہ اینٹی غزل بلکہ

یہ غزلیں ایک خود شناس وفور آگاہ شاعر کے وجدان کا نتیجہ ہیں

مزید وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاعر کا مزاج غزل سے شروع ہی سے مناسبت رکھتا ہے انھوں نے گویا غزل کے فارم کو ابتداء ہی سے قبول کیا تھا اس کے بعد کچھ مثالیں غزل کے مسلسل فارم کی پیش کی ہیں۔ میں نے ابھی اوپر تحریر کیا ہے اور سرخ سویرا کے حوالے سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ نظموں میں غزلیہ رنگ اور تکنیک کا احساس شاذ تمکنت کو بھی ہے لیکن مخدوم نے غزل گوئی عمر کے آخری حصہ میں شروع کی تھی۔ اس کی وجہ بھی حیات معاشقہ کے باب میں شاذ تمکنت بتاتے ہیں:

مخدوم نے اگر واقعی ٹوٹ کر چاہا تو وہ ایک خاتون ہے یہ خاتون بے حد خوب صورت اور ملکوتی حسن کی مالک ہیں اس عشق کے چرچے

حیدرآباد کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں عام رہے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ خاتون نہ ہوتیں تو مخدوم غزل کی طرف نہ آتے۔

گل ترکی عشقیہ

شاعری کے کم وبیش تمام تر حصہ کا سہرا انھیں کے سر جاتا ہے

اب ذرا ان کی پہلی غزل جو کہ طرحی غزل ہے اس پر غور کیا جائے

سیماب وشی، تشنہ لبی، بے خبری ہے
اس دشت میں گر رخت سفر ہے تو یہی ہے

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے

بے صحبت رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی مئے وہی میخانہ وہی ہے

اس عہد میں بھی دولت کونین کے باوصف
ہر گام پہ ان کی جو کمی تھی سو کمی ہے

ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخی ایام بھی پی ہے

دھڑکا ہے دل زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

وہ عطر تری کاکل شب رنگ نے چھڑکا
مہکی ہے خرد روح کلی بن کے کھلی ہے

اس غزل میں کیف ونشاط اور سرورومستی کا عالم ملتا ہے ایسانہیں کہ یہ عالم اردو شاعری میں پہلی بار جلوہ گر ہوا ہے۔قلی قطب شاہ، وؔلی، سوؔدا،مومؔن، داؔغ،حسرؔت،جگؔر،اصؔغراور جوشؔ سے ہوتا ہوا فیضؔ اور فراقؔ تک اپنے الگ الگ انداز میں ملتا ہے۔غزل میں دہرانے کا عمل سب سے زیادہ ہے یہی اس کی خوبی بھی ہے اور یہی اس کی خامی بھی ،اس لئے یہاں ہر بات نئی لذت کے ساتھ دہرائی جاتی ہے اسی لئے غزل کو لہجے کی شاعری کہا جاتا ہے۔مخدوم بھی روایت سے منسلک ہوکر اپنے لہجے کی شناخت قائم کرنے میں یہاں کامیاب نظر آتے ہیں ان کے اسلوب کی تازگی اور شگفتگی اپنی جانب کھینچنے لگتی ہے۔شاذ تمکنت نے ان کے جس معاشقے کا ذکر کیا ہے اس کی جھلک بھی اس غزل میں موجود ہے چند اشعار اور ان کی غزلوں کے کیف ونشاط کی سرمستی والے پیش ہیں جن میں دل کی بے تابی شاد کامی میں ڈوب گئی ہے

کون جانے کہ ہو کیا رنگ سحر رنگ چمن
میکدہ رقص میں پچھلے پہر سے پہلے

یہ کوہ کیا ہے یہ دشت الم فزا کیا ہے
جو اک تری تری نگہ دل نواز ساتھ رہے

کمان ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دید یار کریں

پھر بلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے
تم بھی آجاؤ کہ باتیں کریں پیمانوں سے

جہاں بھی بیٹھے ہیں جس جا بھی رات مئے پی ہے
انھیں کی آنکھوں کے قصے انھیں کے پیار کی بات

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لئے
جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لئے

ان کے پہلو کے مہکتے ہوئے شاداں جھونکے
یوں چلے جیسے شرابی کا خرام آہستہ

ان اشعار میں یا ان جیسے اشعار میں جو کیف وسرمستی ہے اس سے ہماری اردو غزل الگ نہیں ہے۔روزِ اول ہی سے ایسے اشعار اردو غزل میں پائے جاتے ہیں۔

مخدوم کی غزلوں کے یہ ایسے اشعار ہیں کہ انھیں ان کے عہد کی تھرتھراتی انسانی آواز سے جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے ان اشعار میں نہ صرف مخدوم کی شخصیت کے پیکر ابھرتے ہیں بلکہ زمانے کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں اور یہ تصویریں زمان ومکاں کی سرحدوں کو پار بھی کر جاتی ہیں ان میں وسعت ہے آفاقیت ہے ان اشعار کو کسی بھی زمانے کے غم یا مسرت سے جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے مثلاً پہلا شعر۔

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

اسے میرؔ کے عہد اور ان کے غم سے بھی جوڑ یئے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ وہاں بھی فٹ نظر آتا ہے میرؔ کے یہاں حزن وملال کی بے شمار بولتی ہوئی تصویریں ہیں ایک شعر اسی منظر نامے کا دیکھئے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اب مخدوم کے شعر پہ غور کیجئے کیا دونوں کی فضا ایک جیسی نہیں ہے۔میرؔ نے چراغ بجھا کر اداسی کے رنگ کی انتہا کر دی ہے۔مخدوم چوں کہ ترقی پسندی سے متاثر تھے اس لئے چراغ جلائے رکھا۔دردؔ نے اس ماحول کی عکاسی اس طرح کی ہے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

مخدومؔ دردؔ کے اس شعر سے کچھ زیادہ قریب ہیں لیکن تینوں شعرا میرؔ، دردؔ اور مخدومؔ کے یہ شعر پہ غور کیجئے تو ایک ہی مضمون کی فضا ملتی ہے کہنے کا انداز الگ الگ ہے۔اس فضا کو آپ غالبؔ کے یہاں بھی ڈھونڈ ھ سکتے ہیں۔فانی کے یہاں بھی ہے فراقؔ کے یہاں بھی ،ناصر کاظمی سے لے کر آج کی نئی نسل کے یہاں بھی یہ رنگ مل جائے گا لیکن اسلوب وآہنگ کا فرق سب کے یہاں ہوگا اسی بنیاد پر تو غزل کو لہجے کی شاعری کہا جاتا ہے۔اگر غزل لہجے کی شاعری ہے تو مخدوم کا بھی اپنا ایک لہجہ ہے جو انھیں منفرد شعراء میں شمار کرا دیتا ہے مخدوم کے بساط رقص میں ایک غزل ایسی ہے جو مخدوم کی تمام غزلوں سے منفرد ہے لہجے کے اعتبار سے بھی اور معنوی سطح سے بھی۔ پہلے اس غزل کو پیش کرتا ہوں تا کہ اس کا سراپا نگاہوں کے سامنے رہے:

گلوئے یزداں میں نوک سناں بھی ٹوٹی ہے
کشاکش دل پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے

سراب ہے کہ حقیقت ہے نظارہ ہے کہ فریب
یقیں بھی ٹوٹا ہے طرز گماں بھی ٹوٹی ہے

سیاست دل آئینہ چور چور تو تھی
سیاست دل آہنگراں بھی ٹوٹی ہے

اندھیری رات کا یہ نیم باز سناٹا
گلوں کی سانس، رگ گلستاں بھی ٹوٹی ہے

تمھارے جسم کا سورج جہاں جہاں ٹوٹا
وہیں وہیں مری زنجیر جاں بھی ٹوٹی ہے

کہاں ہیں عالم امکاں وجود میں آئیں
نظر نظر ہی رہی ہے جہاں بھی ٹوٹی ہے

شکست و ریخت زمانے کی خوب ہے مخدوم
خودی بھی ٹوٹی ہے خوئے بتاں بھی ٹوٹی ہے

اس غزل میں جواسلوب وآہنگ ملتے ہیں وہ مخدوم کی تمام غزلوں سےمنفرد ہیں اس میں انہوں نے دل کے کرب اورنظریئے کے اصول کوفکروفن میں ایسا گھول دیا ہے کہ لہجے کی تیزی میں نہ صرف دل کی تڑپ دکھائی دیتی ہے بلکہ جسم اورروح کی کشاکش بھی نظر آتی ہے۔اس میں ان کے اندرون ذات اور بیرون ذات کا تصادم بھی ملتا ہے مخدوم کی تمام زندگی کے شکست وریخت اس غزل میں پنہاں ہیں اسی مقطع میں شکست وریخت کوانہوں نے زمانے کے حوالے سے دیکھنا چاہاہے۔پوری غزل ذہنی کشمکش کی پیکرطرازی سے بھری ہوئی ہے اگرلب ولہجہ کی بات ہوتو قافیہ میں حیدرآبادی لطف بھی ملتا ہے جو وہاں کی ایک خاص زبان ہے یعنی ن غنہ کا استعمال لیکن اضافی ن غنہ پیغمبراں اورآہنگر اں میں ہی ملتا ہے۔اب غزل کی تراکیب لفظی کی تجسیم پرغور کیجئے۔گلوئے یزداں،نوک سناں، کشاکش،دل پیغمبراں،سیاست دل آئینہ،سیاست دل آہنگراں گلوں کی سانس،رگ گلستاں،جسم کا سورج،زنجیر جاں

کیا یہ سارے ڈکشن مخدوم کے اپنے نہیں ہیں؟ اوران کی امیجری اردوغزل کو نیا روپ نہیں عطا کرتی ہے مخدوم کی غزل گوئی کے بارے میں عطاالرحمان لکھتے ہیں

> مخدوم کی غزلیہ شاعری کے ایک عمومی جائزے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ ان کے غزل آشنا ہونے کی ہے۔ ایسانہیں ہے کہ غزل آشنائی ایک ایسا جوہرعظیم ہے جس کے فوراًبعد آدمی میرؔ، غالبؔ یا اقبالؔ بن جاتا ہے لیکن مخدوم کے معاملے میں یہ بات اس لئے کافی اہم ہے کہ ان کی نسل کے بیشترشعراءغزل ناآشنا رہے ہیں اور اپنی ناآشنائی میں انہوں نے غزل کوسلیقے سے برتنے کی کوئی کوشش نہیں کی

عطاالرحمان کی یہ بات بہت حدتک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ترقی پسند شعراء کے سب سے بڑے واحدغزل گومجروح سلطان پوری بھی ایک وقت میں لڑکھڑا گئے تھے اورترقی پسندی کے نعروں سے غزل کومجروح کرنے لگے تھے

امن کا جھنڈا اس دھرتی پرکس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر ہے کا چیلا مارلے ساتھی جانے نہ پائے

اپنے ہی سنکٹ کے بھنور میں چکرائی ٹرومین کی نیّا
ڈھونڈتی ہے تنکے کا سہارا تنکا بھی کام آنے نہ پائے

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہوکے رہے گی دھرتی اپنی ملک ہمارا ہو کے رہے گا

لینن کے پیغام کی جئے ہو اسٹالن کے نام کی جئے ہو — جئے ہو اس دھرتی کی جس پر اپنا اجارہ ہو کے رہے گا

کیا ہے ذکر آتش و ریشم کہ عذاران گل — مارتے ہیں ہاتھ انگاروں پہ گھبرائے ہوئے

یہ تو مقام شکر آیا کہ مجروحؔ سنبھل گئے اور غزل کی حرمت کو پہچان گئے ورنہ ترقی پسندوں کے یہاں غزل پوری طرح ملیامیٹ ہوگئی ہوتی۔فیضؔ ایک ایسے شاعر ہیں یعنی ترقی پسندوں میں جن کے فکر وفن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ملتی ہے لیکن فیضؔ اور مخدومؔ میں بہت ساری باتیں یکسانیت کے باوجود منفرد نظر آتی ہیں مثلاً غزل کے حوالے سے دیکھئے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے	چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے	فیض
پھر بلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے	تم بھی آجاؤ کہ باتیں کریں پیمانوں سے	مخدوم
نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مئے پی ہے	عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے	فیض
آج تو تلخئ دوراں بھی بہت ہلکی ہے	گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں	مخدوم
جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے	صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے	فیض
ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس	جرم چپ، سر بہ گریباں ہے جفا آخر شب	مخدوم

شاذ تمکنت لکھتے ہیں:

> ترقی پسند شعراء میں مخدوم پنے معاصرین میں کسے سے قریب نظر آتے ہیں تو وہ فیض ہیں۔مخدوم اور فیض کے کلام کی قدر مشترک لب ولہجہ کی شائستگی ہے جس کا خمیر داخلیت، درون بینی اور نغمگی سے اٹھا ہے۔مخدومؔ اور فیضؔ دونوں کا یہ ہنر ہے کہ خارجی موضوعات کو اس طرح رچا بسا کر پیش کرتے ہیں کہ موضوع مشاہدہ نہیں ذاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے

مخدوم کی وفات کے کم وبیش دس برس بعد فیض نے دو غزلیں مخدوم کی زمینوں میں لکھیں ۔ یہ غزلیں فیض سے مخدوم کے ذہنی لگاؤ کا نمونہ ہیں ۔ بقول فیض یہ غزلیں مخدوم کے انداز میں کہی گئی ہیں ۔ یہاں پر دونوں شاعروں کی دونوں غزلیں پیش ہیں

مخدوم

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر — چشم نم مسکراتی رہی رات بھر
رات بھر درد کی شمع جلتی رہی — غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر
بانسری کی سریلی سہانی صدا — یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

فیضؔ

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

گاہ جلتی ہوئی گاہ بجھتی ہوئی
شمع غم جھلملاتی رہی رات بھر

کوئی خوشبو بدلتی رہی پیرہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر

کل صبا، سایہ شاخ گل کے تلے
کوئی قصہ سناتی رہی رات بھر

جو نہ آیا اسے کوئی زنجیر در
ہر صدا پر بلاتی رہی رات بھر

مخدوم

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزہ آخر شب
اور بھی سرخ ہے رخسار حیا آخر شب

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقش کف پا آخر شب

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیر در مئے خانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخر شب

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
کوئی لیتا تھا ترا نام وفا آخر شب

گل ہے قندیل حرم، گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دست دعا آخر شب

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ سر بہ گریباں ہے جفا آخر شب

اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اسی انداز سے چل باد صبا آخر شب

فیض

پھر کسی یاد کا دروازہ کھلا آخر شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے بقا آخر شب

صبح پھوٹی کہ وہ پہلو سے اٹھا آخر شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخر شب

چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخر شب
کون کرتا ہے وفا عہد وفا آخر شب

عکس جاناں نہ لئے مستی پیمانہ لئے
حمد باری کو اٹھے دست دعا آخر شب

گھر جو ویراں تھا سر شام وہ کیسے کیسے
فرقت یار سے آباد کیا آخر شب

جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اول صبح
اسی انداز سے چل باد صبا آخر شب

فیضؔ نے پہلی غزل میں مصرعہ اول اور دوسری غزل میں مصرعہ آخر مخدوم کا ہی مصرع استعمال کیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے انھیں مخدوم سے بڑی عقیدت تھی اور یہ غزلیں بھی تعلق خاطر کا ثبوت فراہم کرتی ہیں لیکن ان دونوں غزلوں کے حوالے سے دونوں کے مزاج کی یکسانیت اور انفرادیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔مخدوم اپنے غم کا اظہار چشم نم کی مسکراہٹ سے کرتے ہیں جب کہ فیض ہنستے ہوئے منظر یعنی چاندنی سے دل دکھانے کی بات کرتے ہیں۔نفس مضمون دونوں کے یہاں ایک ہی ہے مگر انداز الگ ہے

شاذ تمکنت فیض اور مخدوم کے اس تعلق پر غزلوں کے حوالے سے یوں روشنی ڈالتے ہیں:

فیض بقول ن م راشد رومان اور حقیقت کے سنگم پر نغمہ خواں ہے۔فیض غم دوراں کا ذکر بھی بغیر غم جاناں کے نہیں کرتے اس شعر میں حمد باری کو حدیث دیگراں مان لیں تو فیض کے لب ولہجہ کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔جس طرح فیض کے یہاں غم دوراں کے لئے غم جاناں کے ذکر کی شرط ہے وہیں حمد باری کے لئے عکس جاناں اور مستی و پیمانہ بھی ضروری ہیں۔آخری شعر مین فیض نے مخدوم کے مصرعہ پر گرہ لگائی ہے گویا فیض نے مخدوم کے اسی انداز کی توضیح پہلے مصرع میں کردی۔فیض اور مخدوم دونوں نے واسوخت کہی ہے دونوں نے اپنے اپنے انداز میں دفتر شکایت کو کھولا ایک آدھ نظم میں فیض نے مخدوم کے مصرعوں سے فائدہ اٹھایا۔مخدوم کی امیج میں ان کی سیاسی زندگی کے خاص رنگ بھرے ہیں۔ فیض کے راول پنڈی کیس نے جس طرح شاعر کی شخصیت کو سیف وقلم عطا کیا اور کوئے یار سے سوئے دار کا راستہ دکھایا اسی طرح مخدوم کی عملی سیاست نے انھیں عوام میں ہیرو کا درجہ عطا کیا ہے لیکن مخدوم کی غزل میں وہ سیاسی کڑھا ہوا درد کم ملتا ہے جو ان کی نظموں کا طرہ امتیاز ہے۔دراصل غزل کی روایت نے بھی مخدوم کو ضبط و تعمیم کا سبق پڑھایا۔چوں کہ شاعر بنیادی طور پر حسن پرست اور عاشقانہ مزاج رکھتا ہے اس لئے اس نے سیاسی اشعار میں بھی جمال کا احترام اس طرح کیا ہے کہ جلال کی تمتماہٹ پر بھی مسکراہٹ کا گمان گزرتا ہے

آخر شب والی غزل کے بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس کی تمام علامتیں سیاسی ہیں اس کی ساری فضا کیرالہ الیکشن کی ہے لیکن روایت کی پاسداری سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عاشقانہ غزل ہے صرف ایک شعر دوسری نوعیت کا ہے

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ سر بہ گریباں ہے جفا آخر شب

☆☆☆☆☆

(صفحہ ۵۶ سے آگے)

(۲) ریو نے برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں اس کو غلط بتایا ہے اور اس کی صحیح تاریخ ۵۲۵ لکھی ہے

(۳) ریو نے بھی برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں ۵۴۵ ہی صحیح بتایا ہے

شیخ سنائی ایک تعارف

صاحبزادہ ڈاکٹرصولت علی خاں
ڈائرکٹراے پی آر آئی ٹونک

غزنین گیارھویں صدی عیسوی انتخاب عالم اورفخر روزگار شہرعلم وفن کےعلاوہ اقبال وافضال کامہتم بالشان مرکز تھا، یہاں سے عدیم المثال فاتحین ابھرے۔علماءوشعراءپیدا ہوئے۔علوم وفنون کے سرچشمے پھوٹے اورحکمت وثقافت کے چرچے ہوئے۔

غزنین سیاست وامارت کا ملجاوماویٰ تو تھا ہی شعروسخن اورعلم وفن کی ایک شہر پناہ بناہوا تھااسی علمی شہرپناہ سے بزرگی اور بڑائی والے شعراء میں حکیم سنائی بھی اپنے نام نامی اور کیفیت کےلحاظ سے بزرگی اور بڑائی اور شہرت کےعلمبردار تھے۔وہ کیفیت کے اعتبار سے ابوالمجد تھے تو نام نامی بھی مجدود تھا یعنی نام میں بھی بزرگی اور کیفیت میں بھی برتری

ان کی ولادت ۴۶۴ھ یعنی ۱۰۷۱ء کےقریب ہوئی تاریخ پیدائش کے بارے میں سب ہی تذکروں میں معرکۃ آلارا تصنیف حدیقۃ الحقیقہ کا حوالہ دیا ہے۔

اسٹورؔی اور رؔیو(۱) نے بھی حدیقہ کا ہی حوالہ دیا ہے۔شعرالعجم پرتنقید کرتے ہوئے پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی نے ’تنقید شعرالعجم‘ میں حکیم سنائی کی عمراس وقت ساٹھ سال بتائی ہے،جب کہ انھوں نے حدیقہ کی تصنیف کی تھی اس اعتبار سے ان کی تاریخ پیدائش ۴۶۴ھ قرار پاتی ہے۔

سنائی نے حدیقہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کم وبیش تیس سال سے شعروشاعری میں مصروف ہیں ان کے کلام میں سب ست قدیم دوقطعے ہیں جوانھوں نے سلطان ابراہیم غزنوی کے وزیرخواجہ محمد بہروز بن احمد کے مرثیہ میں لکھے تھے۔اس طرح سلطان مسعود اوراس کے وزیر یوسف بن احمد کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔سنائی بلخ گئے اور وہاں سے حج کیااور بلخ ہی میں انھوں نے اپنی مثنوی کارنامہ لکھی جس میں تین سوساٹھ اشعار ہیں۔بلخ میں خواجہ اسد ہروی کی وجہ سے سنائی پریشان ہوکر سرخس چلے گئے،ان کے دیوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہرات،نیشاپور وغیرہ کا بھی سفر کیا لیکن وہ ۵۲۲ھ تک غزنین واپس آچکے تھے کیوں کہ حدیقۃ الحقیقہ کی تصنیف میں وہ دس سال سے مصروف کار ہوگئے تھے۔سرنس کے مفتی شرق ابوالفاخر محمد بن منصور کی مدح میں کئی ترکیب بند اور ایک مثنوی ’سرالمعادالی المعاذ‘ جس میں سلوک وتصوف،اخلاق وعادات اورتہذیب وثقافت کا ذکر ہے ملتے ہیں۔

حکیم سنائی ایک معلم کے لائق وفائق فرزندارجمند تھے جیسا کہ انھوں نے حدیقہ کے دیباچہ میں لکھا ہے،یہ تصنیف انھوں نے خواجہ رئیس احمد بن مسعود کی فرمائش پرلکھی تھی جوایک سال میں مکمل ہوئی جیسا کہ اس شعر سے واضح ہوتا ہے

پانصد و بست و چار رفتہ زعام پانصد و سی و پنج گشتہ تمام (۲)

لیکن ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی جنہوں نے اپنے دادا پروفیسر محمود خاں شیرانی کی تمام وکمال تصانیف اور مقالات آٹھ جلدوں میں مقالات شیرانی کے نام سے مرتب کر کے شائع کئے ،وہ فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ حدیقہ کے بعض نسخوں میں آخر کا مصرعہ اس طرح ہے ع پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

یعنی ۵۲۷ھ تصنیف تمام ہوئی ۔اس اعتبار سے حدیقہ ایک سال میں مکمل ہوئی۔ پروفیسر شیرانی حدیقہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں بعض اشعار الحاقی بھی ہیں۔ جیسے کہ جنگ جمل سے متعلق منظوم کئے گئے ہیں۔ حدیقہ میں دس باب ہیں۔

تقدیس وتمجید،نعت،صفت العقل،فضیلۃ العالم،غفلت،صفت الاخلاق،حکمت وامثال،عشق اور حسب حال وغیرہ اس کے علاوہ قصائد بھی ہیں

اس مثنوی حدیقۃ الحقیقۃ وشریعۃ الطریقت کو خلیلی نے اپنی کتاب 'حکیم سنائی' میں 'الٰہی نامہ' بھی لکھا ہے۔ یہ مثنوی اخلاق و مذہب پر ایک نصیحت آمیز نظم ہے ،لیکن بعض علمائے غزنین نے اس کی مخالفت کی اور امام الاجل برہان الدین ملقب بریا لگر کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ بغداد کے علماء کو دکھائیں جنہوں نے اس مثنوی کو عقائد کے موافق قرار دیا۔اس مثنوی میں ساٹھ سے اسی اشعار ہیں جو سلوک حقیقت،عرفان اور اخلاقیات پر محتوی ہیں۔اس مثنوی کے علاوہ انہوں نے اور مثنویاں بھی یادگار چھوڑی ہیں جیسے 'غریب نامہ' 'کارنامہ بلخ'، 'عشق نامہ' اور 'عقل نامہ'

خلیلی نے حکیم سنائی سے ایک افسانہ بہرام و بہروز بھی منسوب کیا ہے ان کے علاوہ حکیم سنائی کا ایک ضخیم ترین دیوان یادگار اسلاف ہے جس میں تیس ہزار اشعار ہیں۔ سنائی امام غزالی سے بے پناہ متاثر تھے،اور ان کا روحانی رشتہ بھی تھا کیوں کہ حکیم سنائی کے پیر خواجہ یوسف ہمدانی،امام غزالی کے پیر بھائی تھے جیسا کہ حضرت جامی نے نفحات الانس میں ذکر کیا ہے۔خلیلی نے سنائی کا ایک فارسی مکتوب بھی نقل کیا ہے جس سے ان کی نثری قدرت اور اسلوب نگارش کے نمونہ ملتے ہیں ۔سنائی کی وفات کے متعلق اٰیتھے نے بوڈلین کی لائبریری کی فہرست میں بحث کی ہے کہ محمد بن علی الرفاع نے حدیقہ سنائی کے دیباچہ میں ۱۱ شعبان مطابق ۳ ردسمبر تو صحیح لکھا ہے لیکن سال ۵۲۵ھ غلط ہے جو ۵۴۹ھ ہونا چاہئے ۔(۳)

اٰیتھے سے تاریخ وفات کی بحث پر ڈاکٹر ہادی حسن،غلام مصطفیٰ خاں اور ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے بھی جزم کیا ہے

اس میں شک نہیں کہ سنائی درباری شاعر تھے انہوں نے سرداروں، بادشاہوں اور وزیروں کی تعریف میں قصائد لکھ کر اپنی معاش پیدا کی لیکن بعد کی زندگی اس نے اخلاقیات اور عرفانیات پر شاعری کرنا شروع کی اور انہوں نے غزنین کو چھوڑ کر مرو سکونت اختیار کر لی جہاں شیخ ابو یعقوب یوسف کے حلقۂ رشاد میں داخل ہو گئے۔

سنائی نے غزل کو نیا رنگ اور نیا مذاق دیا ان سے پہلے غزل میں واردات اور مشاہدات کو مجاز کے پردے میں بیان نہیں کیا جاتا تھا لیکن انہوں نے تصوف وسلوک وعرفانیات کے مضامین خرابات کے پردہ میں ادا کر کے غزل کے میدان کو وسیع بنا دیا۔اس طرح انہوں نے تشبیہ واستعارات کے ذریعہ گل وبلبل،عشق ومحبت،سرمستی ومہر جوشہ کے مضامین،زندگی کے واردات ومشاہدات سے ہم آہنگ کئے اور حسین پیرایہ میں زندگی کو غزل اور غزل کو زندگی کی آبرو بنا دیا۔

سنائی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مقطع میں تخلص کا رواج شروع کیا جو ایک حسین ودل پذیر روایت بن گئی۔انہوں نے ہی حقیقت کو مجاز کی زبان عطا کی اور اسلوب کو رنگین مذاق دیا،اور مذاق میں جدت اور تنوع پیدا کیا۔

پروفیسر محمود شیرانی لکھتے ہیں اگر چہ ان کے مذاق میں ندرت بھی غالب ہے تاہم تغزل کو خرابات کا راستہ بتانے والے حکیم سنائی ہیں۔عرفان اور رندی کے حسین امتزاج سے انہوں نے غزل کو مالا مال کیا۔عطارؔ اور مولانا رومؔ انہیں کی بنیادوں پر قصر وایوان تعمیر کرتے ہیں۔قصہ مختصر سنائؔی کے ہاں شاعری بلحاظ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے اور زہد خشک کا خاتمہ ہوتا ہے۔

زہد جیسے سخت ترین رہ گذر کو رندی وسرمستی کے پردے میں بیان کرنے والے حکیم سنائی ایک نئے مذاق سلیم کی بنیاد رکھتے ہیں،رندی اور سرمستی کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے،میخانہ آباد کیا جاتا ہے،زہد سے اعتزال ہوتا ہے اور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے لیکن ان سب کو اعلیٰ وارفع مضامین میں اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ مجاز کے پردے میں واردات ومشاہدات زندگی کو اس انداز سے کہہ دیا جائے جیسے حسین ڈالیوں سے شوخ شگوفے چٹک جاتے ہیں یا سوتے پھوٹ جاتے ہیں اور صحن چمن میں جیسے شبنم موتی بکھیر دیتی ہے۔

ان کی اس تغزل وتصوف اور روش شاعری کی رومؔی،عطارؔ،حافظؔ یہاں تک کہ اقبالؔ نے بھی اتباع کی ہے رومی نے اس طرح اعتراف کیا ہے:

عطار روح بود سنائی دو چشم او   ما یان از پے سنائی و عطارؔ آمدیم

حکیم سنائی حقیقت میں اپنی حدیقۃ الحقیقۃ میں ایک حکیم،ایک معلم ایک صوفی عارف کامل اور ایک ایسے شاعر نکتہ داں نظر آتے ہیں جس نے متقدمیں شعراء کی اتباع کرتے ہوئے سبک فارسی میں ایک نیا مذاق،نیا پیرایۂ بیان،دل پسند اسلوب اور حسین تراکیب واسالیب پیدا کر کے تغزل وتفکر میں نیا انقلاب پیدا کر دیا۔اسی انقلاب سے فارسی شاعری آج بھی حکیم سنائی کو ان کے کمال وجمال،ندرت خیال اور انداز بیان پر خراج عقیدت پیش کرتی ہے

حوالے:

(۱) ریو نے برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں سن ولادت ۴۳۷ھ لکھا ہے   (آگے صفحہ ۵۳ پر)